

# تزکیہ نفس

خواتین کی تربیتی نشستوں کے لیے چند مضامین اخلاق و احسان کا مجموعہ

وقال فلان تزکیہ نفس  
فصل فی تزکیہ نفس  
مجموعہ مقالات

شعبہ احادیث  
مکتبہ اہلسنت

انجمن خدام القرآن سندھ کراچی

[www.QuranAcademy.com](http://www.QuranAcademy.com)

# تزکیہ نفس

خواتین کی تربیتی نشستوں کے لیے  
چند مضامین اخلاق و احسان کا مجموعہ

انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی کے زیر اہتمام  
شائع ہونے والی کتاب ”تزکیہ نفس“ کے کامل سات حصے



انجمن خدام القرآن سندھ کراچی ریسٹورڈ



نام کتاب : تذکیہ نفس  
 ناشر : مدیر شعبہ مطبوعات، انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی رجسٹرڈ  
 مرکزی دفتر، انجمن خدام القرآن سندھ کراچی B-375 پبلی منزل  
 علامہ بشیر احمد عثمانی ریسٹورنٹ روڈ بلاک 6، گلشن اقبال، کراچی، پاکستان  
 فون : +92-21-34993436-7  
 مقام اشاعت : شعبہ مطبوعات، قرآن اکیڈمی یسین آباد  
 شارع قرآن اکیڈمی، بلاک 9، فیڈرل بی ایریا، کراچی  
 فون : +92-21-36806561

ای میل : [Publications@QuranAcademy.com](mailto:Publications@QuranAcademy.com)

ویب سائٹ : [www.QuranAcademy.com](http://www.QuranAcademy.com)

طبع اول : 1100

تعداد : 1100

ہدیہ : 350

ملک بھر میں قرآن اکیڈمیز و مراکز

**Karachi:**

Quran Academy Defence 021-35340022-4

Quran Academy Yaseenabad 021-36337361 -

36806561

Quran Academy Korangi 021-35074664

Quran Institute Gulistan-e-Johar 021-34030119

**Hyderabad:**

Quran Academy Qasimabad 022-2106187

Quran Institute latifabad 022-3860489

**Sukkur:**

Quran Markaz Sukkur 071-5807281

**Quetta:**

Quran Academy Quetta 081-2842969

**Jhang:**

Quran Academy Jhang 047-7630861 - 7630863

**Faisalabad:**

Quran Academy Faisalabad 041-2437618

**Lahore:**

Quran Academy Lahore 042-35869501-3

**Multan:**

Quran Academy Multan 061-6510451 - 6520451

**Islamabad:**

Quran Academy Islamabad 051-2605725

**Gujranwala:**

Quran Markaz Gujranwala 055-3891695 -

0334-4600937

**Peshawar:**

Quran Markaz Peshawar 091-2584824 - 2019541

**Malakand:**

Quran Markaz Temargara 0945-601337

**Azad Kashmir:**

Quran Markaz Muzaffarabad 0982-2447221



31	تناسب کی ضرورت		<b>باب اول</b>
32	اخلاقی بیماریوں کا آغاز دل سے ہوتا ہے	13	مفہوم اور مقصد
33	سوچ اور جذبے کی بگاڑ کا سبب	13	نظام طہارت
33	اللہ کا ذکر: دل کی اصلاح کا ذریعہ	14	تزکیہ ایک مسلسل عمل
36	جہلت و فطرت کے توازن سے اندرونی و بیرونی امن	15	دل و دماغ کی طہارت
36	شیطان کے ہاتھوں فطرت و جہلت میں بگاڑ	16	تزکیہ کے چار پہلو
38	بنیادی انسانی قوتوں میں اعتدال و توازن	16	تزکیہ کی شرائط
38	1: قوت علم	16	تزکیہ اندرونی حسن کا ذریعہ
39	2: قوت عقل	17	اسلام کا تصور اخلاق
40	3: قوت غضب	18	تزکیہ کے ذرائع
41	4: قوت شہوت	19	مقاصد بعثت رسول صلی اللہ علیہ وسلم
41	5: قوت عدل	20	جنت میں جانے کے راستے
43	ادب	20	نیکوں کی حفاظت
43	اللہ کا ادب	21	جنت کے اعلیٰ درجات کا حصول
45	قرآن کا ادب	22	تزکیہ اور اخلاق
46	جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب	22	قرآن و سنت کے علم کی ضرورت
48	انسانوں کا ادب	23	تزکیہ کی راہ میں احتیاط
48	عمر میں بڑوں کا ادب	24	تزکیہ میں اعتدال اور حقیقت بینی کی اہمیت
48	بچوں کو خادمین کا ادب کرنا سکھانے	25	تزکیہ اور قرآن
49	عہدے میں بڑوں کا ادب	25	معرفت انسان کی اہمیت
49	رتبے میں بڑوں کا ادب	28	انسان کی فطرت
50	ادب کے لیے کھڑا ہونا ضروری نہیں	28	انسان کی جہلت
50	کسی قوم کے بڑے کا ادب	29	انسانی عادات
51	آج بے ادبی کا کلچر عام ہے	31	فطرت اور جہلت کا مقصد ہیں





77	تقید کرنے میں اسراف	51	بڑوں کا ادب کیسے ہو؟
78	تعریف میں اسراف	52	اسلاف میں علماء اور اساتذہ کی عزت
80	جذبات کا اسراف	52	ادب اور حکم میں تصادم
81	خوشی غمی کے موقع پر وقت کا اسراف	54	تواضع کا احترام
82	عام زندگی میں وقت کا اسراف	55	قانون کے فوائد
83	اسراف کا تعین	56	اسلام میں پابندی، اطاعت اور نظم و نسق
83	پیسے میں اسراف	57	عادتوں کو فطرت کے قریب کیا جائے
85	خواہشات اور اسراف	58	”ادب“ اور ”احترام“
85	نمود و نمائش اور اسراف	61	انا
85	اسراف کی حدود اور اس سے بچنے کی تدبیر	61	انا
86	اسراف کے متعلق اصل تصور	63	انسانی امتحان کے لیے شعور ذات و اختیار
89	کھانے میں اسراف	63	اللہ کی ”انا“ اور انسان کی ”انا“
91	قدرتی وسائل میں اسراف	64	انسان کے لیے اپنے مقام و مرتبے کی پہچان
93	بخل	67	عزت و بقائے نفس
93	بخل	70	تقویٰ اور اس کا اثر
95	بخل کا دائرہ	71	انا میں اعتدال
95	مال میں بخل		<b>باب دوم</b>
96	کفالت میں بخل	73	اسراف
96	عبادات میں بخل	73	لفظ اسراف کا مفہوم
97	مروت میں بخل	74	اسراف اور غلو کے لغوی معنی
99	بخل نفرت کا سبب	74	آواز کا اسراف
100	مروت میں بخل کی ایک اور مثال	75	باتوں میں اسراف
101	صدقہ میں بخل	76	جسمانی حرکات میں اسراف
103	بخل کی بد نصیبی	77	اعتراض میں اسراف

## باب سوم

## تکبر و تذلل

129	تکبر کیا چیز ہے؟
130	تکبر کی شناخت اور درجات
131	تکبر کا پہلا مرحلہ ”عجب“
131	عجب کی پہچان
132	دوسرا مرحلہ ”فخر“
132	تیسرا مرحلہ ”اصل تکبر“
133	فخر اور تکبر کی پہچان
135	خاندان پر فخر و تکبر
137	خاندانی تکبر سے بچنے کا طریقہ
137	مسلمان امت پر شیطان کا ایک حملہ
139	حُسن پر فخر
139	عجب کا ایک اظہار
141	تکبر کی ضد: تذلل
143	فرقہ ملامتیہ کا طرز عمل
144	تذلل کے نقصانات
144	تذلل پیدا ہونے کے اسباب
145	تذلل کا علاج
146	تذلل والوں کی مدد اور علاج
148	تواضع
148	تواضع کی فضیلت
148	تواضع کی حقیقت

104	لباس میں بخل
104	سلام میں بخل
105	بچوں کو بخیلی سے بچائیں
105	مہمانوں کے ساتھ بخل
106	فالتو چیزوں میں بخل
106	جذبات میں بخل
107	تعریف میں بخل
108	معذرت کرنے میں بخل
108	غفلت کا بخل
108	روزمرہ استعمال ہونے والی اشیاء میں بخل
109	بخل کا علاج
111	بخل اور اسراف یکجا
112	کنجوسی اور کفایت شعاری کا فرق
113	خلاصہ
116	دکھاوا
117	دکھاوا اور بطر کے معاشی اثرات
118	جشن تہنیت
119	بچوں میں بطر
120	دوسروں سے بھی دکھاوے کا تقاضا
123	بطر کے فوری نقصانات
124	دکھاوے اور بطر کا علاج
125	بطر کی علامات
127	راہ عمل





174	بڑی سرکشی	150	تکبر اور تذلل کا ترکیبہ
175	ماحتوں کی سرکشی	150	دوسرے کی حوصلہ افزائی کے لیے اپنا ذکر کر سکتے ہیں
176	بغاوت کا ضرر	151	عجب اور تکبر سے بچنے کے اور طریقے
176	بغاوت کرنے والوں کا رویہ	152	تواضع کی صورت
178	ازراہ مذاق سرکشی	155	تکبر کا علاج
180	مطالبات میں سرکشی	155	تواضع حاصل کرنے کا طریقہ
180	سرکشی ترک کرنے کے لیے صحیح انسان بننا	156	تکبر، تذلل اور تواضع کی مثالیں
182	قیامت میں سرکشی کا حساب	161	ریا کاری
	باب چہارم		
185	توقعات	161	سمعہ
185	اپنے آپ سے توقع	162	ریاری کاری کی نشانیاں
186	اچھی توقع کا فائدہ	164	ریا کاری کے مختلف انداز
186	توقعات پر پورا اترنے کے لیے ذہنی تیاری	164	خرچ کرنے میں ریا کاری
	ضروری ہے	164	لباس میں ریا کاری
187	اللہ سے توقع	165	گناہوں پر افسوس کرنے میں ریا کاری
190	دوسروں سے توقعات	165	محفل اور تہائی کی نماز وغیرہ
191	دوسروں کی ہم سے توقعات	166	ریا کی ایک اور علامت
191	دوسرے سے کچھ کرنے کی توقع	167	ریا کے سہارے کوئی عمل قبول نہیں
193	رشتہ داروں کا خیال بلا توقع اللہ کے لیے رکھا جائے	169	ریا کا تعلق نیت سے ہے
194	دنیا میں راحت سے رہنے کا ایک ہی نسخہ:	170	ریا کا علاج
	مخلوق سے توقع نہ رکھنا	172	ریا کاری کا خوف
194	والدین کی اولاد سے بے جا توقعات	173	سرکشی
		173	کمتر سرکشی

223 دو چیزوں میں حیا نہیں

## باب پنجم

225 حُب

225 حُب

226 شیطان محبت کا غلط استعمال سکھاتا ہے

227 محبت کی اقسام

227 واجب محبت

228 اللہ سے محبت میں اپنا ہی سکون و اطمینان ہے

228 انسانوں سے محبت بھی اللہ کی خاطر ہو

228 اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت

230 دل میں اللہ کی محبت پیدا کے لیے مشق کی

ضرورت ہے

232 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت

234 قرآن سے محبت

234 کعبہ سے محبت

235 صحابہ کرامؓ اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت

235 دین کے مددگاروں سے محبت

236 اللہ سے سچی محبت کی نشانی

236 مباح محبتیں

237 مباح محبتوں کی اہمیت

238 مباح محبتوں کی حدود

240 اللہ سے دنیوی خوشیوں کے لیے محبت رکھنا

240 اصل حق اللہ اور اس کے دین کا ہے

194 نہ شکر یہ مانگو نہ شکایت کرو

197 تصورات

202 تخیل

204 انسانی

206 تصور، تخیل اور وسوسے میں فرق

208 حمیت

208 حمیت سب سے پہلے اللہ اور اس کے دین کے لیے

211 حیا

211 حیا انسان کا خاصہ

211 حیا انسان کی فطرت میں ہے

212 منکرات میں مبتلا ہونا

213 حیا کا روایتی تصور

213 حیا ایک پورے رویے کا نام ہے

213 اللہ تعالیٰ سے حیا

214 والدین سے حیا

215 موجودہ دور میں حیا کی جگہ بے حیائی نے لے لی

216 بچوں کو حیا کی راہ پر ڈالیں

217 حیا بہادری و مردانگی دکھانے میں رکاوٹ نہیں

218 لڑکے کیا لڑکیاں بھی حیا کھو بیٹھیں

218 حیا کی زندگی

219 جسم اور ذاتی معاملات میں حیا

220 حیا اور بے حیائی کی تاثیر

221 بچوں کی تربیت میں حیا کا خاص خیال رکھا جائے





266	دفتہ کے متعلق امانت	240	حرام محبت
268	پبلک مقامات وغیرہ کی خیانت	277	مختلف محبتوں کی نشاندہی
269	گھریلو کمالات میں خیانت	247	حوص
269	میاں بیوی کے متعلق بات	247	مطلوب حوص
270	بجلی میں خیانت	249	بری حوص
270	سسرال کی امانت	250	آخرت کا حریص پرسکون، دنیا کا حریص بے سکون
271	میکے کی امانت	251	حوص کے مقابلہ میں قناعت
272	سب سے بڑی خیانت	253	حوص اور بخل
272	اساتذہ کی خیانت	254	خیانت
<b>باب ششم</b>		254	نفاق
273	غصہ	256	مختلف امانتیں
273	غصہ	256	اللہ کی امانت
274	دین اور اللہ کی خاطر غصہ	257	اپنی ذات کی امانت
278	غصے کی وجوہ	258	انسانوں کی امانتیں
278	غصے کا علاج	259	عہدے کی امانت
280	غصے کے مفاسد	260	خیانت کے جواب میں خیانت
281	غصے کی دوسری وجہ	261	مریض کی بات امانت
281	غصے کے لیے تدابیر	262	خیانت پر خیانت
282	غصے کا علاج	262	کسی کا فون یا چھپی بات سننا
285	غصے کی تیسری وجہ	262	دھوکا اور خیانت
286	علاج	263	وعدہ اور خیانت
287	غصے کی چوتھی وجہ	266	مشورے کی امانت
289	غصے کی پانچویں وجہ		

310	بغض کا محل	292	غصے کے بعد معذرت اور افسوس
311	سسرالی رشتوں میں بغض	292	ناگزیر غصہ
312	بغض سے بچاؤ	292	غصہ کا غلط اور صحیح اظہار
316	بغض کی دوسری وجہ	294	غصے کا سلسلہ وار رد عمل
317	اس بغض کا علاج	294	غصے کی ضرر رسانی
318	بغض کی ایک اور وجہ	295	بغض لوگوں کا غلط خیال
319	بغض کا علاج	295	علاج
<b>باب ہفتم</b>		296	غصہ کی وجہ سے مختلف عوارض
321	جھوٹ	297	مزید اثرات و نقصانات
321	جھوٹ، منافق کی علامت	297	غصے کے متعلق راہ عمل
322	جھوٹ کی وجوہ	298	خاموش غصہ
323	ناگوار صورت حال میں جھوٹ	299	غصہ کیسے ختم کیا جائے
323	دل رکھنے کو جھوٹ	300	غصہ پر قابو پانے کے فائدے
325	علاج کی ضرورت	302	غصے کا ایک مثبت پہلو
326	سستی اور کابلی کی وجہ سے جھوٹ	303	غصے کے وقت درست حکمت عملی
326	غیر حقیقی وعدہ	304	حلم اور بردباری کا ایک واقعہ
327	بھول جانے کی وجہ سے جھوٹ	305	غصے کا مناسب اور اصلاحی اظہار
328	بچوں کو بہلانے کے لیے جھوٹ	306	غصہ کسی مسئلہ کا حل نہیں
328	اپنا یا دوسروں کا مرتبہ بڑھانے کے لیے جھوٹ	307	مزاج سے غصہ میں نہیں آنا چاہیے
329	نالنے کے لیے جھوٹ	307	خواتین ٹھکن وغیرہ کی وجہ سے بد مزاج نہ ہوں
329	پیسے دینے میں جھوٹ	308	خواتین کے لیے خصوصی نصیحت
330	عجلت اور تاخیر والا جھوٹ	310	بغض
		310	بغض





353	حسد سے اصل نقصان حاسد ہی کا ہوتا ہے	331	لاڈ میں جھوٹ
353	رشک کی صورت حال	332	خوابوں میں جھوٹ
354	حسد کا علاج	333	تعریف میں جھوٹ
355	جس کو یہ اندیشہ ہو کہ لوگ مجھ سے جلتے ہیں وہ کیا کرے	333	نکٹ وغیرہ میں رعایت کے لیے جھوٹ
356	کسل	334	دام کم کروانے کے لیے جھوٹ
356	کسل	335	احادیث میں جھوٹ
357	کاہلی کو چھپا کر عذر پیش کرنا	336	جھوٹی قسم
358	مصرفیت کی اہمیت	338	جھوٹی گواہی
361	سستی کا مقابلہ کیا جائے	339	جھوٹی گواہی کی مختلف شکلیں
363	نعمتوں کی بڑی تقیم	340	وہ مواقع جن میں جھوٹ بولنا جائز ہے
364	نسیان النعمۃ	342	حسد
365	دنیاوی نعمتوں میں آزمائش	342	حسد کی وجوہ
368	کراہیت الذم، لوگوں کی طرف سے مذمت کی پروا نہ کریں	343	حسد کا علاج
372	کراہیت الموت	344	حسد کے درجے
373	موت کی تیاری	346	حسد کا دوسرا درجہ
374	موت کو یاد رکھنے کے فوائد	346	شکوے کے بجائے شکر کریں
375	موت سے فرار کفار کی علامت	347	حسد کا تیسرا درجہ
375	موت سے فرار ہونے کی خرابیاں	351	بچوں کے حسد کی حقیقت
		351	حسد کی خرابی
		352	رشک
		352	حسد کی ابتداء اور ظہور

## پیش لفظ

(بہ موقع اشاعت دوم)

بفضل اللہ تعالیٰ ”تزکیہ نفس“ حصہ اول تا ہفتم“ کی از سر نو یکجا اشاعت شعبہ مطبوعات انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی کی جانب سے پیش خدمت ہے۔ تزکیہ نفس کے بحث کا دین میں مطلوب و مقصود کا درجہ رکھتا ہر قسم کے ریب و شک سے بالاتر ہے۔ نصوص دین اس بات پر شاہد ہیں کہ انسان کے افعال و اعمال کا عند اللہ مقبول ہونا اخلاص نیت پر موقوف ہے، جس کی جہد مسلسل کا عنوان تزکیہ نفس ہے۔ مزید برآں جہاں انسانی شخصیت میں افکار و اعمال کی اصلاح مطلوب ہے، وہیں انسانی طبیعت و مزاج کا تزکیہ فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے، جسے حدیث جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام میں درجہ احسان قرار دیا گیا ہے۔ تزکیہ و تصوف ہی وہ مضبوط ڈھال ہے جو بندہ مؤمن کو تعلیم و تعلم، دعوت و تبلیغ، اور جہاد و اقامت دین کے حد درجے عظیم لیکن نہایت پرخطر میدانوں میں شہر و نفسانی اور وساوس شیطانی سے محفوظ و مأمون رکھتی ہے، اور وہ تریاق ہے جو حسب دنیا اور مادہ پرستی کے سم قاتل کو بے اثر بنا کر انسان کو طالبِ آخرت بناتا ہے۔ ایسے ہی نفوس مزکی کے لیے فلاحِ اخروی اور جنت میں داخلہ مخصوص ہے: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى (الاعلیٰ: 14) ترجمہ: فلاح اس نے پائی ہے جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ جَنَّتٍ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذَلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكَّى (طہ 76) ترجمہ: وہ ہمیشہ رہنے والے باغات جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور یہ صلہ ہے اس کا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔

انسانی عقل حیاتِ دنیوی کے بارے میں افراط و تفریط کے دھکوں کا شکار رہی ہے۔





حیوانیت محض اور رہبانیت کی انتہاؤں کے مابین وحی ربانی نے زہد و تمہیل کے مطلوب و معتدل رویے کی جانب رہنمائی کی ہے، جسے ہر دور کے اہل علم و رشد نے اپنے زمانے کی مناسبت سے واضح کیا ہے۔ زمانہ جدید کے اعتبار سے تزکیہ نفس کے اصول و طریقہ کار کی تشریح و توضیح کے کام میں ایک مفید اضافہ محترمہ ہما نجم الحسن صاحبہ کے ان بیانات کا ہوا ہے جن میں محترمہ نے خواتین سے خطاب کرتے ہوئے تزکیہ نفس کے عمومی اصول اور خاص کر خواتین سے متعلق امور کی وضاحت کی ہے۔

ان بیانات کو تنظیم اسلامی حلقہ خواتین سے منسلک چند رفیقات نے محنت و عرق ریزی کے ساتھ کیسٹ سے صفحہ قرطاس پر اتارا، جسے انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی کے شعبہ تحقیق میں فنی - editing کے مراحل سے گزار کر شائع کیا گیا۔ واضح رہے کہ ۲۰۱۴ء میں اس کتاب کی اولین اشاعت ۷ متفرق کتابچوں کی صورت میں کی گئی تھی، جنہیں بحمد اللہ افادہ عام کی غرض سے اب یکجا شائع کیا جا رہا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور ادارے کے جملہ افراد کے حق میں صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین۔!

۵/ مئی ۲۰۱۷ء

۸/ شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ

صدر انجمن خدام القرآن، سندھ کراچی

قرآن اکیڈمی یسین آباد کراچی

## تزکیہ

مفہوم اور مقصد:

تزکیے کے معنی ہیں کہ انسان برائیوں سے اپنے آپ کو پاک کر لے اور اپنی اچھائیوں کو پروان چڑھائے۔ بنیادی طور پر تزکیے کا مقصد اور حاصل یہ ہے کہ انسانوں کو گناہوں سے نجات مل جائے اور نیک کام زیادہ سے زیادہ کرنے لگ جائیں۔ اس ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا کے الفاظ درج ذیل ہیں:

اَللّٰهُمَّ اِنِّى نَفْسِى تَقْوٰهَا وَ زَكٰىهَا وَ زَكَّيْتُهَا اَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكَّاهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَ مَوْلَاهَا (۱)

”اے اللہ تو میرے نفس کو اُس کا تقویٰ عطا کر دے اور تو اس کو پاک کر دے، تو بہترین نفس کو پاک کرنے والا ہے۔ تو ہی اس کا ولی ہے اور تو ہی اس کا مولا ہے۔“

تزکیے کے لیے کسی بھی زبان میں کوئی متبادل لفظ ڈھونڈنا آسان نہیں ہے، لفظ ”پاکی“ (Purity) بھی ایک محدود تصور دماغ میں لاتا ہے۔ اسی طرح لفظ ”صفائی“ سے بھی ایک محدود تصور ابھرتا ہے۔ لفظ تزکیہ اُن الفاظ میں سے محسوس ہوتا ہے کہ جن کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں۔ چنانچہ ہم اس بحث میں کسی دوسری زبان کا کوئی متبادل لفظ استعمال کرنے کے بجائے تزکیے کے لیے تزکیہ ہی کا لفظ استعمال کریں گے۔ اسی قبیل کا ایک اور لفظ ”تقویٰ“ ہے۔ اس لفظ کے لیے بھی ہم دنیا کی کسی اور زبان میں کوئی متبادل لفظ نہیں ڈھونڈ سکتے۔

نظامِ طہارت:

انسان جب اپنے چاروں سمت نظر دوڑاتا ہے، تو اس کا مشاہدہ اس جانب رہنمائی کرتا ہے کہ ہر جاندار ایک ایسے نظام کے تحت زندگی بسر کر رہا ہے جو اُس کے جسم کی اندرونی گندگی کو خود بخود صاف کرتا رہتا ہے، صحت مند جسم کے لیے یہ نظام صفائی نہایت ضروری ہے۔ اگر کوئی بہترین غذا استعمال کرتا ہو، لیکن اس کا نظام صفائی درست نہ ہو تو وہ صحت مند نہیں رہ سکتا، بہترین غذا کا استعمال بھی صحت مند زندگی کا ضامن نہیں۔ جہاں تک جسم کی اندرونی صفائی کا تعلق ہے، یہ خود بخود (automatically) ہوتی رہتی ہے، جب کہ جسم کو ظاہری طور پر صاف ستھرا رکھنا ہر مخلوق کی اپنی

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبہ والاسْتِغْفَار، باب التَّوْبَةِ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلَ۔۔۔





ذمہ داری ہے، یہ عمل دو لحاظ سے ضروری ہے، اولاً صحت کے طبی اصولوں)

(medical principles) کے تحت اپنے آپ کو پاک و صاف رکھنا ضروری ہے اور ثانیاً اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو جمالیاتی حس (aesthetic sense) رکھی ہے، اُس حس کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے آپ کو صاف رکھے، چنانچہ انسان نہ صرف اپنے آپ کو صاف رکھتا ہے بلکہ زینت بھی اختیار کرنا چاہتا ہے۔ یہ تقاضا انسان میں فطری طور پر موجود ہے۔ نہ صرف انسان بلکہ یہ شعور جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنے بچوں کو بھی ظاہری طوساً آئینہ آئینہ پر صاف ستھرا رکھیں۔

ظاہری صفائی کا یہ عمل ایک دفعہ کے لیے کافی نہیں بلکہ خود کو مستقل صاف رکھنا مطلوب ہے جو کہ ایک مسلسل عمل ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ایک دن اپنے آپ کو صاف کر لیا تھا چنانچہ اب ایک ہفتے تک مجھے اپنے آپ کو صاف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ایک دن دانت صاف کر لیے تھے اس لیے اب ایک ہفتہ مسواک کرنے یا برش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، یا ایک بار میں غسل کر چکا لہذا اب ایک مہینہ مجھے نہانے کی ضرورت نہیں۔ درحقیقت انسان اپنے آپ کو صاف کرتا ہے، پھر کچھ نہ کچھ گنگدی اُس کو لاحق ہو جاتی ہے جس کو دور کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ یعنی اپنے ظاہری وجود کی طہارت ایک مسلسل عمل ہے۔

### تزکیہ ایک مسلسل عمل:

ظاہری طہارت کی طرح تزکیہ بھی ایک مسلسل اور زندگی بھر کا عمل ہے۔ جیسے ظاہری صفائی حاصل کرتے ہیں، ساتھ ہی ہم دنیا کے کام بھی نمٹاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح تزکیہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ بندہ کہے کہ پہلے میں یہ کام کر لوں اور اس کے بعد زندگی کے باقی سارے کام شروع کر دوں گا۔ جیسے کہ روزمرہ عادت (routine) میں ہم صفائی کرتے ہیں اور باقی زندگی کے کام بھی کرتے رہتے ہیں اسی طرح تزکیہ کا عمل ہم باقاعدہ اپنی روزمرہ زندگی کے دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ جاری رکھیں۔ جب تک ہم زندہ ہیں اس کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ کوئی جُزوقتی کام نہیں ہے بلکہ زندگی بھر کا عمل ہے۔ تزکیے کا عمل ایسا نہیں ہے کہ چند دنوں میں یا چند سالوں میں اس کو مکمل کر لیا جائے، یہ محدود وقت میں مکمل نہیں ہو سکتا کیوں کہ بندہ اپنا تزکیہ کرتا ہے تو کوئی اور بُرائی اس کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے پھر اُس بُرائی کو دُور کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور اگر

کوئی بُرائی نہ بھی لگے تب بھی جب تک زندہ ہیں بُرائیوں سے پالا پڑنے کا امکان تو بہر حال موجود ہے، اسی لیے تزکیہ کا زندگی کے آخری لمحے تک مسلسل جاری رہنا ضروری ہے۔

گندگی کو دور کرنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ پہلی یہ کہ انسان کو گندگی کی پہچان ہو، پتہ ہو کہ یہ گندگی ہے، نجاست ہے اور اس بات کا احساس ہو۔ دوسری یہ کہ اُس کے پاس ایسے ذرائع ہوں جن سے وہ خود کو اس گندگی سے پاک و صاف کر سکتا ہو۔ جب انسان کی ظاہری گندگی دُور ہوتی رہتی ہے تو وہ خود صحت مند رہتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کے لیے اُس کا وجود خوش گوار ہوتا ہے۔ اُس کی موجودگی (presence) دوسروں کے لیے خوش گوار (pleasant) ہو جاتی ہے۔ لوگ اُس کی صحبت میں بیٹھتے ہوئے گھبراتے نہیں جب کہ گندے لوگوں کے پاس بیٹھنے سے گھبراتے ہیں۔ پاک و صاف لوگوں کے پاس بیٹھنا لوگوں کو اچھا لگتا ہے، خوبصورتیٰ بزمِ شادمانہ گوار لگتا ہے۔

یہاں تک جو معاملہ بیان ہوا وہ انسانوں اور جانوروں میں یکساں ہے، یعنی جسمانی اور ظاہری صفائی کا معاملہ مخلوقات میں یہاں تک مشترک ہے۔ پالتو جانوروں کو ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی گندگی کو کھود کر دبا دیتے ہیں، اپنے آپ کو مٹی میں لوٹ پوٹ کر صاف کر لیتے ہیں۔ اس سے آگے اب معاملہ مختلف ہو جاتا ہے۔ جانور تو صرف جسم کی ہی صفائی پر اکتفا کرتے ہیں کیوں کہ جانور کی اصل جسمی ہے یعنی (جان + ور)، اس کے اندر کوئی اور جہت (dimension)، یا وجود کا کوئی اور طبقہ (level) ہے ہی نہیں۔ جانور صرف جسمانی سطح پر زندہ رہتا ہے۔ جب کہ انسان نرا جانور نہیں ہے، بلکہ اُس کے وجود کے کئی پہلو یا جہتیں ہیں۔ ایک پہلو انسان کی سوچ (thought process) ہے جس کا تعلق ذہن سے ہے، ایک پہلو انسان کی روح ہے اور روح کا تعلق دل سے ہے۔

## دل و دماغ کی طہارت:

انسان کو چاہیے کہ جسم کے ساتھ ساتھ دل و دماغ کی طہارت کا بھی خیال رکھے، تاکہ وہ ذہنی اور روحانی طور پر بھی صحت مند رہے۔ اپنے خیالات اور اپنے جذبات کو پاکیزہ رکھنا دراصل صحت مند شخصیت کا راز ہے۔ جانوروں اور انسانوں میں فرق یہی ہے کہ جانور کی کوئی شخصیت (personality) نہیں ہوتی۔ اُسے اپنے ہونے کا احساس نہیں ہوتا، جب کہ انسان کی ایک شخصیت ہوتی ہے، جس کا اُسے احساس بھی ہوتا ہے۔ صحت مند شخصیت کے لیے اپنے جذبات اور خیالات کو پاکیزہ رکھنا ہوگا۔ اس طرح انسان خود اپنے لیے فائدے مند





(productive) ہو جاتا ہے اور مخلوق سے بھی تعلق بہتر طریقے پر نبھاتا ہے۔ پر وقار، خوش گوار شخصیت کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش اخلاق بھی ہوتا ہے۔ عقیدے کو پاک رکھنے سے روح کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے، اس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ خالق سے درست تعلق، درست اور پاکیزہ عقیدے پر منحصر ہے۔

تزکیے کے چار پہلو:

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق تزکیے کے چار پہلو ہیں۔ چار پہلوؤں سے انسان کو اپنی صفائی کرنے کی ضرورت ہے۔ (۱) عقیدے کو شرک سے پاک رکھنا۔ (۲) دل کو حسد، تکبر، نفاق وغیرہ سے پاک رکھنا۔ (۳) جسم کو بری حرکتوں سے پاک رکھنا۔ (۴) لباس اور جسم کو گندگی سے پاک رکھنا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر پہلی دو باتوں میں انسان کو کامیابی مل جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ باقی دو خود بخود انسان کو حاصل ہو جائیں گی۔

تزکیے کی شرائط:

عقیدے کو، سوچ کو، اعمال کو اور اخلاق کو پاک کرنے کی وہی دو شرائط ہیں جو جسمانی پاکیزگی کی ہیں۔ یعنی گندگی اور بُرائی کی پہچان ہو، احساس ہو اور پاکیا کی حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں کہ جن سے انسان اپنے آپ کو پاک کر سکے۔

جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے، پہچان اور احساس، یہ انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ (ingrained) ہے، جنینیات (genes) کے اندر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

{ فَالْهَيْهَاتَ فَجُورَهَا وَتَقْوَاهَا } (الشمس: ۸)

”پس اس نے (نفس) میں الہام کر دیا اُس کا فسق و فجور اور اُس کا تقویٰ۔“  
یہ چیز انسان کے اندر موجود ہے کہ وہ اپنی بُرائی اور اچھائی کو جانتا ہے۔

تزکیہ اندرونی حسن کا ذریعہ:

تزکیہ انسان کو داخلی طور پر خوبصورت اور حسین بناتا ہے۔ انسان فطرتاً حسن پسند واقع ہوا ہے، خوبصورتی کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے ((إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ)) (۱) ”بے شک اللہ خوبصورت ہے اور وہ خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے۔“

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر و بیانہ

انسان بھی خوبصورتی میں کشش (attraction) محسوس کرتا ہے۔ یعنی خوبصورت مناظر اُسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ جہاں تک انسانی شکل و صورت کا تعلق ہے، وہ اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے، وہ ہمارے بس میں نہیں۔ لیکن اپنے باطن، سوچ، عقیدہ، دل اور ذہن کو خوبصورت بنانا ہمارے اختیار میں ہے۔ جو اپنی سوچ، عقیدے اور عمل کو خوبصورت بنالے وہ اللہ کی نظر میں حسین بن جاتا ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ دُعا فرمایا کرتے تھے، مسند احمد میں یہ دُعا موجود ہے:

((اللَّهُمَّ كَمَا أَحْسَنْتَ خَلْقِي فَأَحْسِنْ خُلُقِي))<sup>(۱)</sup>

”اے اللہ جیسے تو نے میری تخلیق خوب صورت کی ہے، میرا اخلاق بھی خوبصورت کر دے۔“

### اسلام کا تصور اخلاق:

ہمارے ہاں عام طور پر جو اخلاق کا تصور پایا جاتا ہے وہ اُس اخلاق کے تصور سے مختلف ہے جس کا ذکر ہمیں قرآن و احادیث میں ملتا ہے۔ دنیاوی لحاظ سے ہم اُس شخص کو خوش اخلاق کہتے ہیں جو باتونی ہو، جو لوگوں کو خوش کر سکتا ہو، جب وہ لوگوں کے درمیان موجود ہو، تو اُس کا اخلاق بہت اچھا ہو۔ یہ چند چیزیں ہیں جن کو ہم اچھا اخلاق کہتے ہیں، یعنی ظاہری طرزِ عمل کو ہم اخلاق کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ اس کا ظاہری معاملہ کیسا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اُس کے تصور اخلاق میں یقیناً یہ چیزیں بھی داخل ہیں کہ دوسروں کے ساتھ آپ کا رویہ کیسا ہے۔ دوسروں کے ساتھ اچھا خوش گوار رویہ رکھنا بھی اچھے اخلاق کا حصہ ہے، مگر یہ کُل اخلاق نہیں، بلکہ اچھے اخلاق کا معیار اس سے کہیں زیادہ جامع (comprehensive) ہے۔ اس میں صحیح عقیدہ، نیت، دل کا خلوص، دل کی پاکیزگی بھی داخل ہے۔ لہذا نبی اکرم ﷺ کی دُعا جو مندرجہ بالا سطور میں درج کی گئی، اُس میں ظاہری اور باطنی تمام چیزوں کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ دل کی صفائی، سوچ کی صفائی، دوسروں کے ساتھ اچھا رویہ، اللہ کے ساتھ اچھا رویہ، دل کے اندر اخلاص اور خلوص ہو، بناوٹ نہ ہو، دوزخا پین نہ ہو، دوسروں کے ساتھ اچھا بننے کے لیے منافقت نہ کرنی پڑے۔ بلکہ جیسا انسان ظاہر میں دوسروں کو بہتر نظر آ رہا ہو، دل کے اندر بھی وہ ویسا ہی ہو۔ یہ ہے دراصل اسلام میں اچھے اخلاق کا تصور اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تو قرآن کی گواہی ہے۔

{وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ} (القلم: ۴)

”بے شک آپ ﷺ تو اخلاق کے اعلیٰ ترین درجہ پر ہیں۔“

(۱) مسند احمد، مسند المکثرین، مسند عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ





اگر کوئی شخص دنیا اور دنیا والوں کی اصلاح کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا چاہتا ہے، تو اُس کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت اچھا اخلاق ہے۔ اب یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اگر انسان بُرے اخلاق سے نجات چاہتا ہے اور اچھے اخلاق اپنانا چاہتا ہے تو اُس کے لیے کوئی ذریعہ بھی چاہیے۔

### تزکیے کے ذرائع:

اوپر ذکر آچکا کہ تزکیے کی دو شرائط ہیں، پہلی شرط یہ کہ اپنی اصلاح کا احساس ہو اور دوسری شرط ذریعے کا حصول ہے جس سے تزکیہ ہو سکے۔ یاد رکھیں تزکیہ کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کا کلام، نبی اکرم ﷺ کے طور طریقے اور پاکیزہ لوگوں کے پاکیزہ کام اور باتیں ہیں، پاکیزہ صحبت بھی اس میں معاون ثابت ہوتی ہے، اس سے بھی انسان کا تزکیہ اور اصلاح ہوتی ہے۔ ان ذرائع سے انسان کی بُرائیاں دُور ہو جاتی ہیں اور اچھائیاں پروان چڑھتی ہیں، پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔

دیکھا جائے تو کسی شے میں خُسن اُسی وقت آتا ہے جب اُس کے عیب دُور ہو جائیں اور خوبیاں نکھر جائیں۔ اگر کسی شے میں عیوب موجود ہوں، گندگی ہو اور دوسری طرف کوئی خوبی بھی موجود ہو تو ہم اُس شے کو خوبصورت نہیں کہتے۔ مثال کے طور پر کسی انسان سے بوا رہی ہو، جسم پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی ہو، بال بکھرے ہوں، ناخنوں میں میل ہو، دانت پیلے ہوں، لباس میلا ہو، اور وہ بہت خوبصورت زیور پہن لے، بہت قیمتی خوشبو لگا لے، انتہائی فیشن ایبل جوتے پہن لے تو ہم اس کو خوبصورت انسان نہیں کہیں گے۔ اسی طرح اگر گھر گندہ ہو، بوا رہی ہو، کپڑے کلوڑے پھر رہے ہوں، دیواروں پر جالے لگے ہوں، مہنگی مہنگی آرائشی چیزیں (decoration pieces) رکھی ہوں اور اُن پر بھی ڈھیر مٹی پڑی ہو۔ تو ایسے گھر کو ہم خوبصورت نہیں کہتے۔ یہ زینت تو ہے مگر خوبصورتی نہیں ہے۔ اس کے برعکس آپ کسی کے گھر جائیں جو بالکل سادہ ہو، قیمتی اشیاء سے تزئین و آرائش نہ کی گئی ہو۔ لیکن وہاں اچھی طرح صفائی ہوئی ہو، سجاوٹ کی چیزیں سلپتے سے رکھی ہوں، تو ہم کہیں گے کہ یہ گھر خوبصورت ہے۔ تو خوبصورتی کے لیے بُرائیوں کا اور گندگی کا دُور ہونا اور ساتھ ساتھ (simultaneously) خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس دوہرے عمل (double process) کا نام ”تزکیہ“ ہے۔ اس کے لیے اصطلاح مستعمل ہے: ”تخلی عن الرذائل و تحلی بالفضائل۔“ (بری خصلتوں سے خالی اور اچھی خصلتوں سے آراستہ ہو جانا) بُرائیاں دُور کی جائیں، اچھائیوں کو اختیار کیا جائے اور اُن کو پروان چڑھایا جائے، اُن کی حفاظت (sustain)

کی جائے تو انسان کے تزکیے کا عمل پورا ہوتا ہے، اور اس کے لیے اللہ کی مدد و رحمت بہر حال ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

{وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَكِنَّ اللَّهَ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ سَمِيمٌ عَلِيمٌ} {النور: ۲۱}

”اے مسلمانو! اگر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت تم پر نہ ہوتی، تو تم میں سے کوئی ایک بھی، کبھی بھی پاک نہ ہو سکتا، لیکن اللہ پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔“  
معلوم یہ ہوا کہ اللہ کے فضل و رحمت اور اُس کے کلام کے بغیر کوئی بھی پاکیزگی اور تزکیہ حاصل نہیں کر سکتا۔

مقاصدِ بعثت رسول ﷺ :

اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت کے جو مقاصد قرآن میں بیان ہوئے ہیں وہ چار ہیں جو کہ یہ ہیں: تلاوت، تزکیہ، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں فرمایا:

{لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ أَلْيَهُمْ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ} {آل عمران: ۱۶۳}

”یقیناً اللہ نے بڑا احسان کیا مومنوں پر جب اُس نے انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور ان کو تعلیم دیتے ہیں کتاب اور حکمت کی۔“

یعنی نبی اکرم ﷺ لوگوں کو اللہ کی آیات پڑھ کر سناتے تھے تاکہ ان کا تزکیہ ہو اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے تھے، اس سے پہلے تو یہ لوگ سراسر گمراہی میں تھے۔ ان کو پتہ ہی نہ تھا کہ پاکیزگی کیسے حاصل کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ طہ میں فرمایا ہے:

{وَمَنْ يَأْتِهِمْ مَوْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّلٰحٰتِ فَأُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الّٰلِيَّٰتُ الّٰلِيَّٰتُ حٰثُّ عَذٰبِنِ تَجْرِبٰتٍ مِّن تَحْتِهَا اَلْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزَاؤُا مَن تَزَكٰى}

{طہ: ۷۵، ۷۶}





”اور جو اُس کے حضور مومن کی حیثیت سے حاضر ہوگا، جس نے نیک عمل کیے ہوں گے، ایسے سب لوگوں کے لیے بلند درجے ہیں۔ سدا بہار باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے اُس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔“

جنت میں جانے کے راستے:

جنت میں جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک بہت آسان، پُر تعیش اور لذتوں بھرا اور دوسرا مشقت والا جس میں قدم قدم پر آزمائشیں اور تکالیف ہیں۔ بعض لوگ پہلا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بڑا خطرناک ہے، وہ دوزخ سے ہو کر جاتا ہے۔ تو ایسا راستہ کیوں اختیار کریں جس میں اتنی مصیبت لاحق ہونے کا خطرہ ہو۔ دوسرا راستہ تھوڑا لمبا، طویل، مشکل اور کٹھن تو ہے مگر سیدھا جنت جاتا ہے۔ اس راستے میں بھٹکنے کی گنجائش نہیں ہے۔ تو کیوں نہ تھوڑی سی محنت و مشقت کر لیں اور براہِ راست جنت میں جانے کی کوشش کریں۔ اللہ بڑا مہربان ہے اُس سے امید رکھنی چاہیے کہ وہ ہمیں ضرور جنت میں پہنچائے گا۔ لیکن جنتِ نری تمنائوں اور خواہشوں سے تو ملنے والی شے ہے نہیں۔ صرف خواہشات (wishful thinking) سے کام نہیں چلے گا بلکہ اس کے لیے مومن ہونا شرط ہے۔ ایمان لاؤ، پھر عملِ صالح کرو؛ صحیح عمل اور سلامت عمل۔ اُردو میں ہم صحیح سلامت مکمل چیز کو کہتے ہیں۔ تو عملِ صالح کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان جو نیکی کرے اُسے مکمل کرے، ادھرے کام نہ کرے۔ اچھے اخلاق اختیار کرے۔ گھر والوں اور باہر والوں کے ساتھ، چھوٹے بڑوں کے ساتھ، سب کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے، اندر کچھ باہر کچھ یہ دوڑ خاپن نہ ہو۔ دوسری چیز جو صالح عمل میں آتی ہے وہ یہ کہ اُس عمل کی حفاظت بھی کی جائے۔

نیکیوں کی حفاظت:

نیک عمل کرنا نسبتاً آسان ہے، لیکن اُس کو سنبھال کر رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ نیکیوں کی اس طرح حفاظت کرنی ہے کہ وہ ضائع نہ ہوں، اُن پر گناہ کی گرد نہ پڑے۔ نفاق یا تکبر کا کیڑا نہ لگے جو ہماری ساری نیکیاں پٹ کر جائے۔ کہیں دکھاوے کا شکار نہ ہو جائیں۔ لہذا انسان ایسے بڑے بڑے گناہوں سے بچے۔ اور کوشش کرے کہ دوسروں کی بُرائی نہ کرے۔ خدا نخواستہ ہماری نیکیاں کسی اور کے کھاتے میں چلی جائیں اور ہمیں خبر بھی نہ ہو۔ نیکیاں ہم نے کیں، شب بیداریاں ہم نے کیں، نوافل ہم نے پڑھے، صدقات ہم نے دیے مگر قیامت کے دن یہ نیکیاں اپنے اعمالِ نانا

میں ڈھونڈ رہے ہیں لیکن نہیں مل رہیں۔ پتہ چلا کسی نوکر کی دل آزاری کی تھی، ہمسائے کی ٹوہ لگائی تھی، رشہ داروں کی غیبت کی تھی، چنانچہ تمام نیکیاں اُن کے پاس چلی گئیں۔ پُنجلی، طنز یا غیبت ایسے اعمال ہیں جو ہماری محنت دوسروں کے نام کروا دیتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی نفسیات یہ ہے کہ کسی نیک عمل کا اُس کو پتہ چلتا ہے تو بہت جوش و خروش سے وہ کام کرنا شروع کرتا ہے، دل جمعی کے ساتھ اس نیک کام کو کرتا رہتا ہے، مگر آہستہ آہستہ اُس نیک کام سے اُس کا دل بھر جاتا ہے اور پھر ایک اور نیکی پتہ چلتی ہے تو اب وہ پہلی والی کو چھوڑ کر دوسری کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر کچھ دن اُس کا جوش و جنون چڑھا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک اور نیکی پتہ چلتی ہے۔ اب وہ دوسری چھوڑ کر تیسری شروع کر دیتا ہے۔ تو یہ طرزِ عمل تو نیکیوں کو پروان چڑھانا نہ ہوا۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک باغ ہے اُس میں آپ نے ایک پودا لگایا، اُس کی خوب حفاظت (care) کی۔ جب وہ ہرا بھرا ہو گیا تو آپ نے ایک اور پودا لگایا، اب دوسرے پودے پر اتنی توجہ ہو گئی کہ پہلے کی طرف سے بالکل لاپرواہ ہو گئے اور اُس کو نظر انداز (neglect) کر دیا۔ اب نہ پانی اور کھاد دیتے ہیں، نہ دیکھ بھال کرتے ہیں، تو وہ مر جھا جائے گا۔ اور اگر آپ کی یہی روش رہی تو کبھی بھی مکمل باغ نہیں بن سکے گا۔ اسی طرح اگر پچھلی نیکیوں کو نظر انداز (neglect) کیے جائیں اور نئی نیکیاں کرتے چلے جائیں تو نیکیوں کا باغ نہیں لگ سکتا، آپ کی زندگی میں نیکیوں کی بہار نہیں آ سکتی۔ تو اس کے لیے پچھلی نیکیوں کی بھی حفاظت کرنی ہے اور مزید نیکیوں کا بھی اہتمام کرنا ہے۔

### جنت کے اعلیٰ درجات کا حصول:

جو انسان اپنا ترکیب کرنا اور جنت کے اعلیٰ درجے حاصل کرنا چاہے، تو اُس کے لیے اہلیت، درست طریقہ اور شوق ہونا چاہیے۔ اگر شوق کے ساتھ اہلیت بھی ہو تو اس سے اچھا امتزاج (combination) کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ آج کل کہتے ہیں نا کہ بہترین کام (best job) وہ ہے جو آپ کا مشغلہ (Hobby) بھی ہو۔ تو اللہ کرے ہمیں اس بہترین کام (best job) کا شوق پیدا ہو جائے، سستی اور غفلت کو چھوڑ دیں، مصلحتوں کو نظر انداز کر دیں۔ بہت مصلحت پرست (diplomatic) بن کر رہنا، سب کو راضی کرنے کی کوشش کرنا، یہ چیز بھی ترکیب نفس کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ بہر حال فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کے لیے جنت تیار کی ہے جو خود کو پاک رکھیں اور اپنا ترکیب کریں۔





اپنا تزکیہ کرنا دراصل خود کو جنت کا شہری بنانے کی کوشش ہے۔ یہ جنت کا شہری بننے کی مشق ہے جو ہمیں کرائی جاتی ہے۔ سورۃ الشمس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا} (الشمس: ۹، ۱۰)

”فلاح پالی اُس نے جس نے نفس کا تزکیہ کیا، اور ناکام و نامراد ہوا جس نے اُسے آلودہ کیا“

**تزکیہ اور اخلاق:**

جس کا تزکیہ ہو گیا، وہ پاک ہو گیا، اُس کے اخلاق سنور گئے، وہ حسین ہو گیا۔ اللہ کو پاک صاف رہنے والے بہت پسند ہیں۔

{وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ} (التوبة: ۱۰۸)

”اللہ پاک رہنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔“

احادیث میں اعلیٰ اخلاق حاصل کرنے کی بھی بڑی ترغیب آئی ہے۔ یعنی تزکیہ دراصل اعلیٰ اخلاق ہے، اعلیٰ اخلاق دراصل تزکیہ ہے۔ بخاری اور مسلم میں حدیث ہے:

((إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا))<sup>(۱)</sup>

”تم میں سے بہترین وہ ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔“

ابوداؤد اور ترمذی میں حدیث ہے، حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ شِئِيَ أَتَقَلَّ فِي مِيزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ))<sup>(۲)</sup>

”قیامت کے دن مومن کی میزان عمل میں اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی چیز کوئی نہ ہوگی۔“

موطاً امام مالک کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((بِعِثْ لِأَتَمِّمْ حَسْنَ الْأَخْلَاقِ))<sup>(۳)</sup>

”میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقی خوبیوں کو کمال تک پہنچا دوں۔“

**قرآن و سنت کے علم کی ضرورت:**

خود کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ کرنے کے لیے انسان کو قرآن اور سنت کے علم کی ضرورت پڑتی

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب صفة النبي صلى الله عليه وسلم

(۲) جامع الترمذی، کتاب البر و الصلة، باب ما جاء في حسن الخلق

(۳) موطأ امام مالک، کتاب الجامع، وحدثني عن مالک انه قد بلغه۔۔۔

ہے۔ یہ علم انسان کے روحانی وجود کی پاکی کے لیے ایسے ہی ضروری ہے جیسے ماڈی جسم کے لیے پانی۔ جب ہم پانی پیتے ہیں تو وہ جسم میں گردش (circulate) کرتا ہے، جس سے جسم نرم رہتا ہے اور زہریلے مادے جسم سے دھل کر نکل جاتے ہیں، زندگی قائم رہتی ہے، صفائی کا عمل ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح علم باطنی تزکیے اور صفائی کا سبب بنتا رہتا ہے۔ اللہ کی آیات پڑھتے ہی تمام بُرائیوں سے نجات نہیں مل جاتی، بلکہ بُرائیاں دُور کرنے کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن پڑھتے ہی انسان میں ساری اچھائیاں پیدا نہیں ہو جاتیں، بلکہ اچھائیاں حاصل کرنے کی طلب جنم لیتی ہے۔ اور یہ طلب (urge) کہ مجھے اچھا بنانا ہے، یعنی اچھائیاں اچھی لگنے لگیں، بُرائیاں بُری لگنے لگیں اور یہ تڑپ پیدا ہو جائے کہ مجھے خود کو درست کرنا ہے۔ یہ طلب تزکیے کا نقطہ آغاز ہے۔ اور یہ طلب ہمارے اندر کلام الہی پیدا کرتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو پاک کریں، اپنی اصلاح کریں، ٹیڑھ سیدھی کر لیں اور قبلہ درست کر لیں۔ جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ منہ تو کھا کر فارغ ہو جاتا ہے لیکن نظام ہاضمہ (Digestive system) گھنٹوں غذا پر کام کرتا ہے۔ ہمارا نظام ہاضمہ کتنی دیر تک غذا کو مختلف قسم کے ماڈوں اور رطوبتوں (Juices) وغیرہ کی مدد سے ہضم کرتا رہتا ہے تاکہ اسے ہمارے جسم کا حصہ بنائے۔ اسی طرح گو کہ قرآن کو محدود مدت میں پڑھا جاتا ہے مگر اُس کو جذب کرتے رہنا، اور اللہ کی آیات کو تزکیے کا ذریعہ بنانا مسلسل کرتے رہنے کا کام ہے۔ قرآن حکیم کو ہم اپنے حافظے (memory) میں محفوظ تو کر لیتے ہیں لیکن اس کو عملی زندگی کا حصہ بنانے کے لیے سالوں درکار ہیں، بلکہ یوں سمجھیں کہ پوری زندگی چاہیے۔ ہم سب اس راستے کے نئے نئے مسافر ہیں۔

### تزکیے کی راہ میں احتیاط :

اگر ہم تزکیے کا عمل شروع کرنا چاہ رہے ہیں تو اس بارے میں محتاط روش اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ انسان کے اخلاقی عیوب یا بُرائیاں اُس کی روح پر زخم کی مانند ہوتی ہیں۔ جیسے انسان کے جسم پر جوٹ لگ جائے تو اسے صفائی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح روح کے زخموں کو بھی صفائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اور بات یہ کہ ہر شے کی صفائی کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ کوئی برتن گندہ ہو جائے تو اُس کو سختی کے ساتھ مانجا جاتا ہے۔ اب اگر اتنی ہی سختی کے ساتھ زخم کو صاف کیا جائے، اُسے رگڑا جائے تو کتنی اذیت اور تکلیف ہوگی اور زخم ٹھیک ہونے کے بجائے مزید خراب ہو جائے گا۔ اس لیے ہمیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ ”اے اللہ جہاں سختی کی ضرورت ہو وہاں



ہمیں سختی کرنے کی ہمت دے اور جہاں نرمی کی ضرورت ہو وہاں نرمی برتنا سکھا دے۔“ شیخ حمزہ یوسف کہتے ہیں کہ جو اس راستے کا نیا نیا مسافر بنے اُسے ہوشیار رہنا چاہیے، خبردار رہنا چاہیے، محتاط رہنا چاہیے کہ وہ اپنے اوپر بہت زیادہ سختی نہ کرے۔ اور دوسری طرف اُسے یہ بھی احتیاط کرنی چاہیے کہ وہ فراٹس میں کو تا ہی کرنا شروع نہ کر دے۔

"Beware of being extremely hard on yourself before you obtain mastery over your self & beware of being too lax in anything that concerns sacred rulings."

انسان جب تزکیہ کا عمل شروع کرتا ہے تو ہو سکتا ہے اُسے یہ خیال آئے کہ ابھی تو ہمارے اندر، ہماری نیت میں، خیالات میں اتنا بگاڑ موجود ہے تو پہلے ہم خود کو اندر سے ٹھیک کرتے ہیں، اُس کے بعد ہم شریعت کی ظاہری شکل پر عمل شروع کریں گے۔ یہ احکامات تو بعد کی باتیں ہیں ہمارے تو اپنے اندر بڑی گندگی ہے، پہلے اُس کو صاف کر لیں۔ یہ شیطان کی طرف سے ایک بہلاوا ہے۔ دراصل تزکیہ کسی وقت کے ساتھ (time bound) نہیں ہے، یہ پہلے یا بعد کا عمل نہیں ہے کہ پہلے ہم یہ کر لیں اور پھر بعد میں شریعت پر عمل کریں گے۔ دراصل جہاں شریعت کا حکم آئے گا اُس پر عمل ہوتا رہے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوں گی، اس لیے ترکیہ نفس بھی ساتھ ہی جاری رہے گا۔ اُن غلطیوں کی اصلاح کرتے جائیں گے اور شریعت پر عمل کرتے جائیں گے۔ یعنی یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ ہیں۔

### ترکیہ میں اعتدال اور حقیقت بینی کی اہمیت:

جب تزکیہ کے نام پر احکام شریعت کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو بگاڑ شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی کوئی اس طرح سوچے کہ ابھی تو ہم غیبت کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں اور بھی نہ جانے کتنے گناہ کرتے ہیں، پہلے ہم ان سے نجات پالیں، پھر ہم ظاہری احکامات پر عمل شروع کریں گے، نماز پڑھیں گے، گھر سے باہر بھی باپردہ ہو کر نکلیں گے، گھر کے اندر کا پردہ بھی کریں گے۔ یاد رکھیں یہ تزکیہ کے راستے میں ایک بہت بڑا دھوکہ ہے۔ ان دھوکوں سے بچنا ہے، اور اپنے ساتھ نہ بے جا سختی کرنی ہے اور نہ بے جا نرمی۔ جہاں تزکیہ کا عمل شروع ہوگا وہاں کئی اخلاقی عیوب کا سامنا ہوگا، ایسا محسوس ہوگا کہ ہر برائی ہمارے اندر موجود ہے۔ جیسے وہ طالب علم جو طب (medicine) پڑھتے ہیں اور بیماریوں کی علامات (symptoms) انہیں پہنچتی ہیں تو بعض کا کہنا یہ ہے کہ ہر علامت

(symptom) پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ بیماری میرے اندر موجود ہے۔ تزکیہ کا معاملہ بھی یہی ہے لیکن جہاں یہ چیز مفید ہے وہاں یہ چیز بعض دفعہ انسان کو مایوسی کی طرف لے جاتی ہے، جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مایوس نہ ہوں بلکہ تزکیہ نفس کی طلب پیدا کرنے کی کوشش کریں اور پھر اس کے بعد خود کو تھوڑا وقت دیں۔ آج ہی سے یہ سلسلہ شروع کر دیں۔ ان خرابیوں کو دور ہوتے ہوتے اور اندر سے نکلتے نکلتے وقت لگے گا۔ اور شعوری طور پر جان لیں کہ مکمل طور پر برائیوں سے نجات نہیں مل سکتی۔ ہم سے فرشتہ بننے کا مطالبہ نہیں کیا گیا بلکہ ہم سے کہا گیا ہے کہ تم اپنا تزکیہ کرتے رہو۔ برائیوں پر ضرور نظر رکھو، انہیں پہچانا اور دور کرنے کی کوشش کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{فَلَا تَزُكُوا أَنْفُسَكُمْ} (النجم: ۳۲)

”اپنے آپ کو پاک مت سمجھو۔“

یعنی اپنی پاکیزگی کے دعوے مت کرو۔ انسان تو فطرتاً کمزور واقع ہوا ہے اور ایک حد تک ہی پاکیزگی حاصل کر سکتا ہے لیکن اس میں احساس اور شعور ہونا چاہیے، شعوری طور پر اپنے آپ کو درست اور ٹھیک کرتا رہے۔ جب انسان اپنے لیے اس طرح کا مبنی بر حقیقت ہدف بناتا ہے تو اُس کے اندر نہ جھنجھلاہٹ (irritation) پیدا ہوتی ہے اور نہ مایوسی اسے گھیرتی ہے۔

تزکیہ اور قرآن:

تزکیہ کا عمل شروع کرنے کے لیے توانائی درکار ہوتی ہے۔ اللہ کی آیات پڑھ کر ایمان میں گرمی اور حلاوت آتی ہے، اسی کی مدد سے تزکیہ ہو سکتا ہے۔ جس طرح تو اگرم کر کے روٹی ڈالیں تو صحیح پکتی ہے، نرم ہوتی ہے، مزیدار ہوتی ہے، صحیح آج لگتی ہے، خوب پھولتی ہے۔ لیکن اگر ٹھنڈے توڑے پر روٹی ڈالیں گے تو پکی ہی رہے گی اور سخت ہو کر پا پڑ بن جائے گی۔ اسی طرح جب اللہ کی آیات سے دل نرم ہو جاتے ہیں تب تزکیہ کا عمل شروع کیا جائے تو فائدہ مند رہے گا۔

معرفت انسان کی اہمیت:

چونکہ تزکیہ کسی نفس کا ہوتا ہے اسی لیے اُس نفس انسانی کا ادراک بہت ضروری ہے کہ ہم جانیں کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ جیسے کسی مشین کو کام میں لانا ہو تو اُس مشین کے بارے میں بنیادی معلومات ہونی چاہیے مثلاً اس کے کون کون سے حصے (parts) ہیں، کل پُرزے کتنے





ہیں، ان کا آپس میں ربط کیا ہے، کس طرح چلتے (function) ہیں، اسی طرح انسان کے بارے میں بھی یہ علم ہونا ضروری ہے کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے، اس کے مشتملات کیا کیا ہیں، کس حصہ کی کیا اہمیت ہے۔ اور اگر ہم اس مشین کو صحیح جگہ استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں پتہ ہونا چاہیے کہ اس کی قوت (potential) کیا ہے؟ اور یہ کیا کچھ کر سکتی ہے؟ اگر ہمیں کسی چیز کی قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوگا تو اس کا کیا خیال رکھیں گے؟ یوں سمجھیں کہ کسی کے پاس ایک قیمتی ہیرا ہے لیکن وہ اس کی قدر و قیمت سے ناواقف ہے، اس کی قیمت (value) کا اندازہ ہی نہیں کہ میرے پاس جو ہیرا ہے یہ کیوں نور ہے۔ جب وہ اس کی قدر و قیمت سے ناواقف ہوگا، اس کی اہمیت سے انجان ہوگا، اس کی حقیقت نہ جانتا ہوگا تو وہ یہی سمجھے گا کہ یہ محض ایک کانچ کا ٹکڑا ہے۔ وہ اس کو بیکار و بے وقعت سمجھے گا اور ہو سکتا ہے وہ اُسے کسی کچرے خانے میں پھینک دے یا کسی پالتو جانور کے گلے میں لٹکا دے یا کھلونا سمجھ کے بچوں کو دیدے۔ لیکن جو شخص اس ہیرے کی قدر و قیمت سے واقف ہوگا، اس کی اہمیت و حقیقت سے آشنا ہوگا تو وہ اُسے کسی بادشاہ کے حضور پیش کرے گا، کسی قدردان کے پاس لے کر جائے گا۔ بالکل اسی طرح اپنی ذات کو درست جگہ پر استعمال کرنے کے لیے، صحیح ہستی کی غلامی اختیار کرنے کے لیے، صحیح ہستی کی خدمت (serve) کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو پہچانیں۔ ہم سب میں سے ہر ایک کو پتہ ہو کہ میں کون ہوں؟ کس قابل ہوں؟ کیا میں حقیر سا کانچ کا ٹکڑا ہوں جس کو کسی جانور کے گلے میں باندھ دیا جائے؟ یا کھلونے کے طور پر برتا جائے؟ کیا میں جانوروں کی غلامی کے قابل ہوں؟ یا میں اعلیٰ وارفع ہوں، بہت قیمتی ہوں، شاہکار (master piece) ہوں، نایاب (unique) ہوں۔ اتنا اعلیٰ ہوں کہ کسی بادشاہ کا غلام بننے کے قابل ہوں۔ تو جو قدر و قیمت ہماری اپنی نگاہ میں ہوگی اسی کے مطابق ہم فیصلہ کریں گے کہ ہمیں اپنی جبلت کے تابع رہنا ہے یا اپنے روحانی وجود کے؟ کیا اس ہستی کی غلامی کروں جو میرا رب ہے، جو کائنات کا بادشاہ ہے، یا دنیا کے مال و متاع کی، یا اپنے نفس کی؟ یہ فیصلہ تو اسی وقت ہو سکے گا جب مجھے اپنے بارے میں علم ہوگا کہ میں کون ہوں، میں کس قابل ہوں؟ خود شناسی (self recognition) خدا شناسی (God recognition) میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو پہچانیں گے تو اپنے رب کی معرفت بھی حاصل کر سکیں گے۔ اگر ہم اپنے آپ کو نہیں پہچانیں گے تو اپنے رب کو بھی نہیں پہچان پائیں گے۔

انسان کے وجود کے کئی پہلو ہیں، کئی جہتیں (Dimensions) ہیں۔ ایک ہے انسان کی فطرت (Nature) جو کہ اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے۔ سورۃ الروم آیت ۳۰ میں ارشادِ الہی ہے:

{فَطَرَتِ اللَّهُ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا} (الروم: ۳۰)

”یہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے جس پر کہ اللہ نے انسانوں کو بنایا ہے۔“

کچھ اقدار ایسی ہوتی ہیں جو انسان کسی کے سکھانے سے نہیں سیکھتا بلکہ سیکھا سکھا یا دنیا میں آتا ہے۔ کچھ اچھائیوں کی پہچان اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ مثلاً توحید، حیا، اللہ کی فرمانبرداری کرنا فطرت میں داخل ہیں۔ انسان کی فطرت میں گندھی ہوئی ہے۔ علم کی طلب اور دوسروں کو سکھانے کا جذبہ (acquiring and imparting knowledge to others) بھی انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ پھر اپنا محاسبہ (accountability) کرنے کا احساس بھی موجود ہے۔ بُرا کام کر کے گناہ کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان فطرتاً ہی احساس لے کر دنیا میں آتا ہے کہ یہ دنیا میرا گھر نہیں ہے، یہ میرا دائی ٹھکانہ نہیں ہے، یہ شعور انسان میں موجود ہے۔ اس حوالے سے سورۃ بقرہ آیات ۳۰ تا ۳۸ کا مطالعہ مفید رہے گا۔ ان آیات میں تخلیقِ آدم کا قصہ بیان ہوا ہے، ان آیات پر تھوڑا سا غور و فکر (Meditate) کر لیا جائے تو بہت سی باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ ان خوبیوں کے ساتھ کچھ بُرائیوں کی پہچان بھی انسان میں فطرتاً موجود ہے۔ کوئی شخص کسی جنگل میں رہتا ہو، کبھی کسی نبی کی دعوت نہ سنی ہو، نہ دنیاوی تعلیم حاصل کی ہو۔ لیکن فطرتاً اسے معلوم ہوگا کہ جھوٹ بولنا بُری بات ہے، دھوکہ دینا بُری بات ہے، چوری کرنا بُری بات ہے۔

{قَالَتْهَا فَجُوزَهَا وَتَقْوَهَا} (الشمس: ۸)

”پھر اللہ نے الہام کر دی اس پر اس کی بدی اور پرہیزگاری“

چونکہ فطرت کے لحاظ سے ہر انسان مومن ہے لہذا مومن بننا کوئی مصنوعی (unnatural) چیز نہیں، بلکہ پیداؤشی طور پر ہر انسان مومن ہوتا ہے، دینِ فطرت لے کر اس دنیا میں آتا ہے، چاہے ہندو کے گھر پیدا ہوا ہو، عیسائی کے گھر، یہودی، آتش پرست یا بت پرست کے گھر پیدا ہوا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ مَوْلُودٍ لَدَىٰ لَدَىٰ عَلَى الْفِطْرَةِ فَآبُو آهِيَهُو دَانِهٖ أَوْ يَنْصَرَانِهٖ أَوْ يَمَجْسَانِهٖ))<sup>(۱)</sup>

”ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے، وہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ تو اُس کے والدین ہیں جو یا تو اُس کو

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب ما قبل فی اولاد المشرکین



یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی۔“

یعنی فطرت کے اندر بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ فطری طور پر انسان کے اندر یہ صلاحیت (potential) موجود ہے کہ وہ فرشتوں سے بڑھ کر مقام حاصل کر لے۔ یہ اُس وقت ہوگا جب کہ وہ اپنی فطرت پر قائم رہے۔ پھر ہی مجہود ملائک اور اشرف المخلوقات کہلانے کے لائق ہوگا۔ سورۃ التین میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ} (التین: ۵)

”یقیناً ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا ہے۔“

انسان کی فطرت:

فطرت کا تعلق روح سے ہے اور روح کا حُسن فطرت پر قائم رہنے میں ہے۔ روح صرف انسان میں ہوتی ہے، فطرت بھی صرف انسان کی ہوتی ہے، جانوروں کی کوئی فطرت نہیں ہوتی۔ جو انسان فطرت کی سطح پر زندگی گزارتا ہے اُس کو دنیا میں چین نہیں آتا۔ وہ لوٹ کر اپنے رب کے پاس جانا چاہتا ہے جہاں سے وہ آیا تھا۔ دراصل روح دنیا کی شے ہے ہی نہیں اسی لیے یہاں اجنبیت محسوس کرتی ہے۔ روح لطیف شے ہے، یہ لوٹ کر اللہ کے پاس جانا چاہتی ہے، اللہ سے ملاقات کا شوق رکھتی ہے۔ دنیا میں اس کا دل نہیں لگتا۔ تو جو فطرت پر زندگی گزارتے ہیں آخرت میں اُن کا نفس مطمئن رہتا ہے۔ سورۃ الفجر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ! اذِجِیْ اِلَی رَبِّکِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً}

(الفجر: ۲۷، ۲۸)

(نیک روح سے خطاب ہوگا) ”اے نفس مطمئنہ! واپس لوٹ اپنے رب کی طرف، تو اُس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔“

انسان کی جبلت:

دوسری سطح ”جبلت“ (instinct) ہے۔ انسان کی فطرت کی طرح اُس کی جبلت بھی اللہ ہی نے بنائی ہے۔ کچھ افعال (actions) ایسے ہیں کہ جو انسان سیکھا سکھا یا دنیا میں آتا ہے۔ کسی کے سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کو پتہ ہوتا ہے کہ اس کو غذا کیسے حاصل کرنی ہے چنانچہ ماں کے جسم سے وہ اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے۔ پھر خوف کا احساس ہے، بچے بھی

خوف محسوس کرتے ہیں، ڈرتے ہیں، چونک جاتے ہیں یہ جبلت کا تقاضا ہے۔ اپنی حفاظت گرنے، اپنی نسل آگے بڑھانا، یعنی بقائے نسل (Preservation of species) اور بقائے ذات کے لیے جدوجہد کرنا بھی جبلت میں داخل ہے۔ جہاں تک جبلت کا تعلق ہے یہ انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ہے۔

جبلت کا تعلق انسان کے حیوانی پہلو سے ہے۔ اس لیے اس کو حیوانی جبلت (animal instinct) بھی کہتے ہیں۔ اب یہ جو انسانی وجود کی دو جہتیں (dimensions) ہیں، ”فطرت اور جبلت“، ”روحانی وجود اور حیوانی وجود“ ان کے ملنے کی جگہ، دونوں کے ملاپ کی جگہ دل ہے۔ یوں سمجھیں کہ دونوں کی گرہ دل میں لگی ہوئی ہے، جب یہ گرہ کھل جاتی ہے تو دل دھڑکنے بند ہو جاتا ہے۔ روح جہاں سے آئی تھی وہاں لوٹ جاتی ہے۔ جسم مٹی سے بنا تھا اسی مٹی میں مل جاتا ہے۔ جبلت کی تمام ضروریات زمین سے پوری ہوتی ہیں۔ جب ضروریات پوری ہو جاتی ہیں، تو خواہشات سر اٹھانے لگتی ہیں اور شیطان انہی خواہشات پر کام کرتا ہے۔ دل میں دنیا کی محبت پیدا ہوتی ہے، خواہشات بڑھے لگتی ہیں اور پھر یہ گناہوں کی طرف لے جاتی ہیں۔

جبلت کا تعلق جسم سے ہے اور جسم مٹی سے بنا ہے۔ جو لوگ جبلت کی سطح پر زندگی گزارتے ہیں وہ دنیا سے جانا نہیں چاہتے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں یہ بات فرمائی ہے کہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ ہزار برس کی زندگی اُس کو مل جائے۔ جبلت انسان کو زمین سے بہت قریب کر دیتی ہے۔ جو لوگ اپنی فطرت کو بالکل بھول جاتے ہیں، اسے نظر انداز (ignore) کرتے ہیں اور صرف جبلت پر زندگی گزارتے ہیں تو وہ اُس کے غلام بن جاتے ہیں، زمین سے لپٹ جاتے ہیں۔ {أَخْلَدْنَا إِلَى الْأَرْضِ} {الاعراف: ۱۷۶} اور ایک طرح سے وہ جانوروں ہی کے مشابہ ہو جاتے ہیں۔ اصل میں ان کا صرف حیوانی وجود زندہ رہ جاتا ہے، اُن کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت سے غافل ہو جاتے ہیں کہ ان کے اندر ایک روح (divine spark) بھی موجود ہے جو روح ربانی ہے، اور ان کی اپنی فطرت بھی ہے۔ اس طرح ان کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے۔

### انسانی عادات:

اب ایک طرف تو ہے فطرت، جو کہ انسانیت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے اور دوسری طرف ہے جبلت جو کہ کمتر درجے پر ہے۔ اگر ہم صحیح ترتیب (order) بنائیں، تو یوں سمجھیں کہ فطرت حاکم





(central authority) ہے۔ اُس کو حاکم ہونا چاہیے۔ اور جبالت معاونین (staff) کی طرح ہے، نوکر چاکر کی طرح ہے۔ ان دونوں کے بیچ ایک اور چیز ہے، وہ ہے عادت۔ عادت یوں سمجھیں کہ رعایا کی طرح ہے۔ فطرت و جبلت میں سے انسان پر جس کی حکمرانی ہوتی ہے، رعایا اُس جیسی ہو جاتی ہے۔ اگر حاکم اچھا ہوتا ہے تو رعایا بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ اگر حاکم بُخ اور گھٹیا ہوتا ہے تو رعایا بھی گھٹیا حرکتیں کرنے لگتی ہے۔ یہ تین درجے یا منزلیں ہیں۔ ایک طرف فطرت ہے، دوسری طرف جبلت ہے۔ فطرت کا تعلق روح سے ہے اور جبلت کا تعلق جسم سے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ (Body is a good slave but a bad master.) جو جبلت کو حاکم (master) بنا دیتے ہیں، پھر وہ خیر حاصل نہیں کر سکتے۔ ان دونوں کے بیچ میں عادت ہے۔ ہم نے بات کی کہ فطرت اور جبلت اللہ نے بنائی ہیں جب کہ عادتیں انسان خود بناتا ہے اور وقت کے ساتھ یہی عادتیں مل کر ہماری طبیعت بن جاتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں اُس کی طبیعت ایسی ہے۔ یہ عادتیں ہی مل کر طبیعتیں بنتی ہیں۔ شیطان عادتوں پر کام کرتا ہے، اور انسانی عادتوں کو پستی کی طرف گھسیٹتا ہے، جبلت کی طرف لے جاتا ہے۔ کہتا ہے صرف اپنے حیوانی تقاضوں (animal instincts) کو یاد رکھو، اور حیوانی تقاضوں کے تحت ہماری عادتیں بنانا چاہتا ہے۔ جب عادتیں جبلت کے تابع ہو جائیں تو پھر انسان پستی میں گر جاتا ہے، عادتیں پست ہو جاتی ہیں۔

{ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ} (التین: ۵)

”پھر اس کو پست سے پست کر دیا“

سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کا ذکر فرمایا:

{لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا

أُولَئِكَ كَانُوا لَنَا عَمْرًا بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ} (الاعراف: ۱۷۹)

”ان کے دل ہیں لیکن وہ ان سے سمجھتے نہیں ہیں، ان کی آنکھیں ہیں لیکن وہ ان سے دیکھتے نہیں ہیں ان کے کان ہیں لیکن وہ ان سے سنتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو کہ غفلت میں ہیں۔“

شیطان عادتوں پر کام کرتا ہے اُن کو اپنے قابو میں کرنا چاہتا ہے۔ اور شریعت بھی عادتوں پر کام کرتی ہے، عادتوں کو بلند کرتی ہے اور اُن کو فطرت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہے،

فطرت کے ماتحت کرنا چاہتی ہے، فطرت کے حساب سے عادتوں کو ڈھالنا اور بنانا چاہتی ہے۔ اسی لیے اسلام کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ عادتوں کو جبالت کے تابع کرنا شیطان کا کام ہے جو انسان کو کفر کی طرف لے جاتا ہے۔ عادتوں کو فطرت کے مطابق بنانا انسان کو اللہ کی طرف لاتا ہے۔ انسان کو اشرف المخلوقات، فرشتوں سے بھی اعلیٰ اور احسن تقویم کے درجے پر لے جاتا ہے۔ تو اصل چیزیں جو انسان کے اخلاق کو متعین (determine) کرتی ہیں اور انسان کے اخلاق کا فیصلہ کرتی ہیں وہ اس کی عادتیں ہیں۔ عادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا اخلاق اچھا ہے یا بُرا۔ اگر فطرت عادتوں پر حاکم ہے، عادتیں فطرت کے تحت ہیں تو اخلاق اچھا ہوگا، اگر عادتیں جبالت کے تحت ہیں تو اخلاق بُرا ہوگا۔

### فطرت اور جبالت بامقصد ہیں:

ایک بات یاد رکھیں کہ فطرت اور جبالت کے اندر جو خصوصیات (qualities) ہیں ان میں سے کوئی چیز بے کار نہیں ہے اور نہ اپنی ذات میں بُری ہے۔ جو چیز جس مقصد کے لیے بنی ہے وہ اس کے لیے ہی کام کر رہی ہے۔ جب وہ چیزیں اپنی جگہ سے ہٹ جائیں، تو پھر وہ بیماری اور نقصان کا سبب بنتی ہیں۔ اور بیماری کے علاج کے لیے علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ بیماری ایک بُرائی ہے، عیب ہے، بد صورتی ہے جب کہ علم خوب صورتی، اچھائی اور خوبی ہے۔

### تناسب کی ضرورت:

ہم کسی شخص کو اُس وقت خوب صورت کہتے ہیں، جب اُس کی آنکھیں، ناک، ہونٹ وغیرہ آپس میں متناسب (Balanced) ہوں۔ تب ہم کہتے ہیں یہ شکل خوب صورت ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو اندرونی خوب صورتی حاصل کرنی ہے، حسنِ اخلاق حاصل کرنا ہے تو انسان کے اندر باطنی طور پر چار قوتوں کا متناسب (proportionate) اور معتدل ہونا ضروری ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق انسان کے اندر درج ذیل چار قوتیں ہیں:

1- قوتِ علم (Power of Knowledge)

2- قوتِ غضب (Power of Passion)

3- قوتِ شہوت (Power of Appetites)

4- قوتِ عدل (Power of Justice)





جب ان قوتوں میں توازن ہوتا ہے، تو انسان کا اخلاق اعلیٰ ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ قوتیں غیر معتدل ہو جائیں، کسی ایک انتہا (extreme) پر چلی جائیں تو یہ اخلاقی بیماریوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

اخلاقی بیماریوں کا آغاز دل سے ہوتا ہے:

جس طرح جسمانی بیماری کا آغاز پہلے جسم کے اندرونی حصے سے ہوتا ہے پھر اُس کی علامات (symptoms) خارجی طور پر ظاہر ہوتی ہیں، بالکل اسی طرح اخلاقی بیماریوں کا آغاز دل سے ہوتا ہے اور پھر اس کی علامات بُری عادتوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں، دل کو جسم اور روح دونوں لحاظ سے اہمیت حاصل ہے۔ مختلف زبانوں میں کسی کے رویے کو ظاہر کرنے کے لیے دل کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں سنگدل، رحمدل، دل کانپ گیا، دل چاہ رہا تھا۔ اسی طرح انگلش میں کہتے ہیں hard hearted، cold hearted soft hearted heartless، heart went out، heart felt وغیرہ قرآن اور احادیث میں بھی دل کا بہت ذکر کیا گیا ہے۔

دماغ کے بننے سے پہلے ہی بچے کا دل ماں کے پیٹ میں دھڑکنا شروع کر دیتا ہے۔ اگر دل اور دماغ کے سارے رابطے (connections) کاٹ بھی دیئے جائیں، پھر بھی دل دھڑکتا رہتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سوچنے سمجھنے کا سارا کام صرف دماغ کا ہے، صرف اُسی کے پاس سوچنے کی صلاحیت (thought process) ہے۔ یہ خیال غلط ہے، دل بھی سوچتا ہے۔

تو یہ محض استعارہ نہیں ہے، کوئی محاورہ (proverb) نہیں ہے بلکہ آج سائنس نے بھی دل کا سوچنا ثابت کر دیا ہے کہ واقعی دل سوچتا ہے اور سمجھتا بھی ہے۔ دل کا اپنا ایک نظام (nervous system) ہے۔ دل میں تقریباً (neurons) 40,000 نیوروز موجود ہیں۔ دماغ دل کو پیغامات پہنچاتا ہے اور دل دماغ کو، یعنی یہ دو طرفہ عمل (two way process) ہے۔ دل کی اپنی ذہانت (intelligence) ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ))<sup>(۱)</sup>

”جسم میں ایک گوشت کی بوٹی ہے، جب وہ ٹھیک رہتی ہے، پورا جسم ٹھیک رہتا ہے، اور جب

اُس میں بگاڑ آ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے۔ آگاہ ہو جاؤ، وہ دل ہے۔“

سوچ اور جذبے کے بگاڑ کا سبب فطرت اور جبلت کا بگاڑ ہے:

جب دل میں بگاڑ آتا ہے تو دماغ تک اُس کا اثر جاتا ہے، انسان کی سوچ اور اُس کے جذبے بیمار ہو جاتے ہیں اور رویے میں اُس کا اثر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ دراصل ہر بُری عادت، ہر گناہ کا بیج (origin) بگڑی ہوئی سوچ یا بگڑا ہوا جذبہ ہے۔

اس بگاڑ کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک وجہ فطرت میں بگاڑ اور دوسری جبلت میں بگاڑ ہے۔ فطرت میں شبہات (doubts) کی وجہ سے بگاڑ آتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ فطرت بگڑنے نہ پائے۔ اسی لیے قرآن کا آغاز {لَا رَيْبَ فِيهِ} سے ہوا ہے یعنی ”اس میں کوئی شک نہیں۔“ اسی طرح ایک اور مقام پر {وَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ} ”تم کسی شک میں مت پڑے رہنا۔“ اور ”مِرْيَةٌ“ بھی شک کو کہتے ہیں۔ یہ اس لیے ارشاد ہوا تاکہ انسان قرآن کے بارے میں کسی شک میں نہ رہے۔ فطرت کا بگاڑ ٹھیک کرنا بہت مشکل کام ہے لہذا فطرت کو ہر حال میں بگڑنے سے بچانا چاہیے۔ جبلت کا بگاڑ آ جائے تو اس کو ٹھیک کرنا نسبتاً آسان ہے۔ لیکن اگر فطرت بگڑ جائے تو اُسے ٹھیک کرنا بہت زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

جبلت میں بگاڑ شہوات (appetites) کی وجہ سے آتا ہے۔ جب شہوات بے قابو ہو جائیں، شریعت کی حدود توڑنے لگیں تو جبلت میں بگاڑ واقع ہو جاتا ہے۔ جائز خواہشات کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کی شریعت میں پوری گنجائش موجود ہے۔ لیکن جب یہ حدیں پار کرنے لگتی ہیں تو قرآن انہی خواہشات کے لیے ”ہواء“ کا لفظ استعمال کرتا ہے یعنی ایسی خواہشات جو کہ شریعت کی حدود کو توڑ کر پوری کی جائیں اور شریعت کا لحاظ نہ کریں، شریعت کے دائرے کے اندر مطمئن نہ رہیں۔ وہ خواہشات پھر بڑھ کر ”ہواء“ بن جاتی ہیں اور انسان شہوت کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ قوتِ عدل، قوتِ علم بے قابو ہو جائیں تو فطرت کے اندر شبہات آتے ہیں اور قوتِ غضب اور قوتِ شہوت بے قابو ہو جائیں تو شہوات کو شہ ملنے لگتی ہے اور وہ بھڑکنے لگتی ہیں۔

اللہ کا ذکر۔ دل کی اصلاح کا ذریعہ:

اگر کوئی دل کی اصلاح چاہتا ہے تو اللہ کی یاد اُس کا ذریعہ ہے۔ دل کی زندگی، اُس کا اطمینان

اللہ کی یاد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:



{الْأَبْدِ كَرِهُهُ تَطْمِئِنُّ الْقُلُوبُ} (الرعد: ۲۸)

”آگاہ ہو جاؤ، اللہ کے ذکر ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔“

دل سلامت ہو تو یہ بڑی نعمت ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انسان کی فطرت سلامت ہے۔ اور ایسا دل قیامت کے روز سب سے قیمتی متاع ہوگا۔ سورۃ الشعراء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۚ إِلَّا مَنْ آتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ} (الشعراء: ۸۹، ۸۸)

”یہ وہ دن ہوگا کہ جس دن نہ مال فائدہ دے گا اور نہ بیٹے مکروہ جو اللہ کے پاس قلب سلیم

لے کر آئے۔“

قرآن حکیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف میں فرمایا:

{إِذْ جَاءَ رَبُّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ} (الضُّفَّت: ۸۴)

”جب وہ آیا اپنے رب کے پاس قلب سلیم لے کر۔“

مومنین کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ کا ذکر سن کر {وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ} ”ان کے دل

کانپ جاتے ہیں۔“ اس کے برخلاف دنیا کی محبت دل کو بیمار کر دیتی ہے، بگاڑ دیتی ہے۔ قرآن میں

ایسے بیمار دل کا بھی ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ} (البقرة: ۱۰)

”اُن کے دلوں میں مرض ہے۔“

{رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ} (المطففين: ۱۴)

”اُن کے دلوں پر زنگ آ گیا ہے۔“

{تَغَيَّرَتِ الْقُلُوبُ} (الحج: ۴۶)

”دل اندھے ہو جاتے ہیں۔“

{عَلَى قُلُوبٍ أَفْعَالُهَا} (محمد: ۲۴)

”ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں۔“

{قَسَّتْ قُلُوبُهُمْ} (البقرة: ۷۴)

”تمہارے دل سخت ہو گئے۔“

یہ تمام خصوصیات جو ہم نے فطرت اور جبلت کی بیان کیں، یہ سب اچھی چیزیں ہیں۔ بگاڑ

اس طرح پیدا ہوا کہ لوگوں نے فطرت کو تو بہت اچھا سمجھا اور جبلت کو بہت برا سمجھا۔ انھوں نے سوچا

کہ ہماری بہتری اسی میں ہے کہ ہم جبلت کے سارے تقاضوں کو مار ڈالیں۔ نفس کشی (self

annihilation) کریں۔ جبلت اگر کھانا مانگتی ہے تو کھانا مت دو، شادی بیاہ مت کرو۔ جسم آرام

مانگتا ہے تو آرام مت دو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ جب انھوں نے یہ سوچا تو تزکیے کا رخ بالکل غلط ہو گیا،

سوچ میں بگاڑ پیدا ہوا۔ انھوں نے سمجھا کہ تزکیے کا مطلب جبلت کو مار ڈالنا ہے۔ لہذا تمام کوششیں

غلط رخ پر چلی گئیں۔ تمام توانائی غلط رخ پر صرف ہو گئی۔ جبالت کو مار ڈالنا مقصد ہے ہی۔ نہیں تیتو اللہ نے ہمارے لیے بنائی ہے۔ حُسنِ اخلاق کا تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ جبالت کو مار ڈالا جائے، کھایا بیانا نہ جائے، نہ ہما بولا جائے، نہ لوگوں سے تعلق قائم کیا جائے اور نہ شادی بیاہ کی جائے۔ مندرجہ بالا سطور میں ذکر آچکا کہ فطرت کا تعلق روح سے ہے، اور روح تنہائی پسند ہوتی ہے۔ انسان اپنی فطرت کو سب سے اچھی طرح اُس وقت پہچانتا ہے جب وہ تنہا ہوتا ہے۔ فطرت کو پہچاننے کے لیے بعض اوقات تنہائی بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جہاں تک جبالت کا تقاضا ہے اس میں انسان گھلنا ملنا چاہتا ہے، لوگوں کے اندر رہنا چاہتا ہے، معاشرتی روابط (social contacts) چاہتا ہے۔ علم نفسیات (psychology) میں کہتے ہیں کہ انسان معاشرتی جانور ہیں (Humans are social animals) تو جبالت کے اندر یہ خاصیت ہے۔ انسان لوگوں کے درمیان بسنا چاہتا ہے، بات چیت کرنا چاہتا ہے، یہ ہماری جمیلی خواہش ہے۔ ملنا جلنا انسان کی ضرورت بھی ہے لیکن غلو کرنے والوں نے یہ کہا کہ جبالت کو مار ڈالو، بادو کسی سے ملنا جلنا نہیں، پہاڑوں میں، غاروں میں جا کر رہو۔ آبادی سے دور دراز جا کر بے سرا کر اور تنہائی اختیار کرو، یہ درست نہیں۔ حُسنِ اخلاق حاصل کرنے کے لیے ان دونوں کو اپنے مقام پر رکھنا ضروری ہے۔ ان دونوں تقاضوں میں اعتدال قائم کرنا ضروری ہے اور دونوں کے تقاضوں کو تسکین فراہم کرنا ضروری ہے۔ جو فطرت کا تقاضا ہے وہ پورا کیا جائے اور جو جمیلی تقاضے ہیں ان کو بھی پورا کیا جائے۔ دونوں کی ضروریات کو پورا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت میں دونوں کے لیے گنجائش موجود ہے۔ فطرت کے تقاضوں اور جبالت کی ضروریات دونوں کو شریعت پورا کرتی ہے، نہ صرف ضروریات بلکہ جائز خواہشات کو بھی پورا کرنے کی شریعت میں گنجائش ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{كَلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ} (الاعراف: ۳۱)

”کھاؤ پیو لیکن حد سے مت بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

یعنی کھانے پینے کو مقصدِ حیات نہ بنالینا۔ ایسا نہ ہو کہ تم جبالت پر اتنا دھیان (focus) دو کہ فطرت کو نظر انداز (neglect) کرنا شروع کر دو۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((الْبِكَاحِ مِنْ سُنَّتِي))<sup>(۱)</sup> ”نکاح میری سنت ہے“، یہ ثواب کا کام ہے، اللہ خوش ہوتا ہے نکاح سے۔ جہاں تک معاشرتی روابط (social links) کا تعلق ہے تو قرآن میں رحمی رشتوں کو نبھانے کا، غریبوں سے

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب ماجاء فی فضل النکاح



مسکینوں سے تعلق قائم رکھنے کا بہت تذکرہ ہے۔ اسلام کا معاشرتی پہلو (social component) بہت مضبوط ہے۔ باجماعت نماز کا نظام، زکوٰۃ کا نظام، حج کا عمل، غرض ان عبادات میں میل جول ہے۔ اسلام کی تعلیم انسانوں سے کٹ کر بیٹھنے کی نہیں ہے بلکہ انسانوں کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کی ہے۔ اسلام نے تو انسانوں سے رابطہ رکھنے کو عبادت قرار دیا ہے، لوگوں سے کٹ جانا اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے، اپنے نفس کو مار ڈالنا یا دبا دینا اسلام کا مقصد نہیں ہے۔ اگر آپ جبلت یا فطرت، دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کریں گے تو حسن اخلاق نہیں آسکتا، انسان کی شخصیت کی تکمیل نہیں ہو سکے گی۔

### جبلت و فطرت کے توازن سے اندرونی و بیرونی امن:

ایمان امن دیتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ انسان کے دونوں پہلو فطرت اور جبلت کے درمیان امن (peaceful co-existence) ہو، دونوں کے حقوق اور ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ اس سے انسان کے گل وجود میں امن رہتا ہے۔ جب اندر امن آجاتا ہے تو باہر بھی پُر امن فضا قائم ہو جاتی ہے۔ (Peace within is peace without) انسان پُر امن بنتا ہے، ایمان والا ہوتا ہے، مومن ہوتا ہے، تو خود بھی امن سے ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی باعث امن ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی یہ حدیث اپنے سامنے رکھیں۔ ((الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَ يَدِهِ))<sup>(۱)</sup> ”مسلمان تو وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھوں سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں“ یہ ہے اسلام! یہ ہے سلامتی! جب انسان کے اندر سچا اخلاق ہوتا ہے تو وہ سچا مسلمان اور سچا مومن ہوتا ہے۔ خود بھی امن سے زندگی بسر کرتا ہے اور دوسروں کو بھی امن سے رہنے دیتا ہے۔ اس کے اندر کوئی احساس محرومی (deprivation) نہیں ہوتی، غیر فطری پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے، اس کے سارے فطری تقاضے اچھی طرح سے پورے ہو رہے ہوتے ہیں۔ لہذا جب ان میں توازن (balance) قائم ہوتا ہے تو حسن اخلاق اور امن آجاتا ہے۔

### شیطان کے ہاتھوں فطرت و جبلت میں بگاڑ:

شیطان جو کہ انسان کا ازلی دشمن ہے، اس کا چیلنج ہے کہ میں ان میں بگاڑ پیدا کروں گا۔ چنانچہ وہ ہم میں لازماً بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ جب فطرت یا جبلت بگڑتی ہے تو فساد پیدا ہو جاتا ہے، ایمان اور اسلام رخصت ہو جاتا ہے، کفر آجاتا ہے اور فرق آجاتا ہے۔

(۱) جامع الترمذی، کتاب القدر، باب ماجاء ان القلوب بين أصبعي الرحمن

سورة النساء کی آیت نمبر ۱۱۹ میں شیطان کا یہ دعویٰ نقل ہوا ہے کہ اس نے کہا تھا:  
 {وَلَا ضَلَّئَهُمْ وَلَا مَنِيَّتَهُمْ وَلَا مَرِئَهُمْ فَلْيَبْتِكُنْ اِذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَا مَرِئَهُمْ  
 فَلْيَعْرِضْ خَلْقَ اللّٰهِ}

”میں لازماً ان کو بہکاؤں گا، میں ضروران کو آرزوؤں میں الجھاؤں گا، اور میں ضروران کو حکم  
 دوں گا تو یہ میرے حکم سے چو پاپوں کے کان کاٹیں گے، اور میں ضروران کو حکم دوں گا تو وہ  
 اللہ کی بنائی ہوئی تخلیق میں تبدیلی کریں گے۔“

فطرت اور جبلت دونوں اللہ نے بنائیں، شیطان چاہتا ہے ان کو بگاڑ دے، لیکن وہ بگاڑ کا  
 لفظ استعمال نہیں کرتا کیوں کہ بظاہر ہمارا بڑا خیر خواہ بنتا ہے۔ بس یہ کہتا ہے کہ فطرت کے تقاضے  
 پورے کرو، جبلت کو دبا دو۔ یا کہے گا صرف جبلت پر نظر (focus) رکھو، فطرت کو رہنے دو۔ فطرت  
 میں شبہات کے ذریعے بگاڑ پیدا کرتا ہے جو بنیادی فطری چیزیں ہیں، توحید، اللہ کی  
 فرمانبرداری، خوداحتسابی (accountability)، حیا، یہ احساس کہ دنیا میرا وطن نہیں ہے ان  
 چیزوں میں شبہات پیدا کرتا ہے۔ کہتا ہے حیا کی تمہیں کیا ضرورت ہے؟ اللہ! وہ ہے بھی کہ نہیں؟ اللہ  
 کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔ فطری تعلیمات میں وسوسوں کے ذریعے شبہات پیدا کرتا ہے۔ قرآن  
 ہمیں دین فطرت سکھاتا ہے۔ قرآن کا آغاز ہی ایسے ہوا: {الْم ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ} (البقرة: ۱، ۲)  
 ”الف لام میم۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔“ پہلے ہی شک کی نفی  
 کر دی کہ تم تو فطرت سنوارنے اُٹھ رہے ہو، شک سے نجات پاؤ، اگر شک سے نجات نہیں پاؤ گے تو  
 فطرت کے تقاضوں کو پورا (fulfill) نہیں کر سکو گے، ان کی تسکین نہیں ہو سکے گی۔ تم اپنی فطرت  
 کو پہچان نہیں پاؤ گے تو شک سے نجات پانا ضروری ہے۔ شک ڈالنا شیطان کا بہت خطرناک ہتھیار  
 ہے۔ اور جبلت میں خواہشات اور شہوات (appetites) کے ذریعے بگاڑ پیدا کرتا ہے، بُرائیوں  
 پر ابھارتا ہے۔ شریعت میں جبلت کی جائز خواہشات کو پورا کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ شیطان  
 انہی خواہشات میں پھونکیں مارتا ہے، اور ان کو اتنا بڑھا دیتا ہے کہ پھر انسان شریعت کے دائرے  
 سے باہر نکل کر ان کو پورا کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ اور جب یہ خواہشات شریعت کے دائرے  
 سے باہر نکلے لگتی ہیں تو ان کو قرآن ”هَوَاء“ کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى}

(النزغ: ۴۰-۴۱)



”اور جو ڈرا اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور اس نے اپنے نفس کو ہوا سے روکا تو بیشک جنت اس کا ٹھکانہ ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی قرآن میں یہ نہیں کہا کہ بندہ اپنی ساری خواہشات ختم کر دے بلکہ ہوا سے روکا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے:

{ذُرِّبَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْخَرْثِ} (آل عمران: ۱۴)

”گھبادی گئی ہے انسان کے دل کے اندر محبتِ شہوات کی یعنی عورتیں، بیٹے، خزانے سونے چاندی کے، نشان لگے ہوئے گھوڑے، جانور اور کھیتی۔“

ان تمام چیزوں کا شوق اور شہوت موجود ہے۔ ان سے منع نہیں کیا گیا کہ تم عورتوں سے محبت مت کرو یا عورتیں اپنے شوہروں سے محبت نہ کریں، یا اولاد کی خواہش ہی نہیں ہونی چاہیے، یا مال اچھائی نہیں لگنا چاہیے۔ یہ سب جہالت کے تقاضے ہیں۔ انھیں پورا کرو لیکن ہوا سے بچو۔ اب اگر ہم اعلیٰ اور عمدہ اخلاق حاصل کرنا چاہتے ہیں تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جو چار چیزیں بتائی ہیں، ان میں اعتدال پیدا کرنا ہوگا۔

### بنیادی انسانی قوتوں میں اعتدال و توازن:

قوتِ علم، قوتِ عقل، قوتِ شہوت اور قوتِ غضب کو اعتدال پر لانا ہوگا۔ ان میں اگر کسی بیشی اور افراط و تفریط ہو جائے تو مختلف اخلاقی بیماریاں جنم لیتی ہیں اور عمل میں بگاڑ پیدا ہونے لگتا ہے۔ اب ذرا اس پہلو پر غور و فکر کر لیتے ہیں کہ جب یہ حد سے بڑھ جاتی ہیں تو کیا شکل اختیار کرتی ہیں؟ کس طرح سے ان کا اظہار ہوتا ہے؟ اور دوسری طرف اگر یہ نقطہ اعتدال سے گر جائیں تو کون سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں؟ اس کا اظہار کس طرح ہوتا ہے؟ اور جب یہ قوتیں معتدل اور متوازن (balanced) ہوتی ہیں تو کیا شکل اختیار کرتی ہیں؟ انسان کے اندر کن چیزوں کا ظہور ہوتا ہے؟ اس پر تھوڑی سی بات کرتے ہیں۔

### 1- قوتِ علم:

ایسا لگتا ہے کہ اس قوت کا تعلق فطرت سے ہے۔ علم حاصل کرنے کی طلب فطرت میں ہے۔ فطرت والی خصوصیات (ingrained qualities) انسانوں میں ہوتی ہیں۔ یہ خصوصیات

جانوروں میں نہیں ہوتیں کیوں کہ جانوروں میں فطرت نہیں ہوتی، صرف جبّت ہوتی ہے۔ (Nature is an exclusively human phenomenon) فطرت کا تعلق چونکہ روح سے ہے تو یہ انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ جانوروں میں صرف جبّت ہوتی ہے، فطرت نہیں ہوتی۔ چونکہ جانوروں میں فطرت نہیں تو ان میں نہ آنا ہے، نہ سوچ سمجھ ہے، نہ غور و فکر کی صلاحیت ہے، نہ حیا ہوتی ہے، نہ اپنا محاسبہ کر سکتے ہیں، نہ پاکیزگی اور صفائی کا احساس (sense) ہوتا ہے، نہ یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا ہمارا گھر نہیں، اور نہ علم حاصل کر سکتے ہیں اور نہ سکھا سکتے ہیں۔ ہاں جبّت کی سطح پر جن جن چیزوں کی ان کو ضرورت ہوتی ہے، وہ ان کے اندر موجود ہیں۔ گھر بنانا، گھونسلہ بنانا ان کی جبّت میں پہلے سے موجود ہے۔ سدھانا (taming) اور چیز ہے علم سیکھنا اور ترقی کرنا دیگر چیز ہے۔ انسان غاروں میں رہتا تھا، علم حاصل کرتے کرتے فلک بوس عمارتیں (sky scrapers) بنانی شروع کر دیں۔ سفر کے لیے موٹر، ریل اور جہاز بنا ڈالے۔ لیکن چڑیا کا گھونسلہ دس ہزار سال پہلے بھی ایسا ہی تھا، آج بھی ویسا ہی ہے، اس میں ترقی نہیں ہوئی۔ دنیاوی ترقی (progress) علم کے حصول سے ہوتی ہے۔ لہذا فطرت والی خصوصیات جانوروں میں نہیں ہیں۔ انسان جب اپنی فطرت کو بھول جاتا ہے یا باگاڑ لیتا ہے تو بالکل جانوروں کی سطح پر آ جاتا ہے۔ اس میں حیا ختم ہو جاتی ہے، اللہ کی طرف لوٹ جانے کا احساس ختم ہو جاتا ہے، اپنے محاسبہ کا احساس، جو اب دینی کا شعور نہیں ہوتا، اللہ کی فرمانبرداری کی طلب اور تڑپ ختم ہو جاتی ہے۔ وہ جانوروں کی سطح پر چیتا ہے، اپنی فطرت کا گلا گھونٹ کر اسے مسخ کر دیتا ہے۔ صرف اس کا حیوانی وجود بچتا ہے، اس کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے جانوروں سے تشبیہ دی ہے۔ اندر کا انسان تو مر گیا ہے، اب وہ صرف حیوانی سطح (animal level) پر زندہ ہے، صرف بھوک اور شہوت کے لیے زندہ ہے۔ بس یہی دو فکریں دامن گیر ہیں کہ پیٹ بھر جائے اور فرج کی تسکین کا سامان ہو جائے، تیسرا کوئی مقصد بچا ہی نہیں۔ لہذا علم کا تعلق ہماری فطرت سے ہے۔

## 2- قوتِ عقل:

قوتِ عقل بھی انسان کے اندر ہے۔ جب یہ حد اعتدال سے بڑھ جائے، حدود سے متجاوز ہو جائے تو انسان کے اندر دھوکہ دہی، چالاکی، عیاری (evil genius) پیدا ہوتی ہے۔ سازشی و مکار ذہانت نمودار ہوتی ہے۔ اور یہ ایک مرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو پھر انسان اللہ کے علم پر





شک کرنے لگتا ہے، اللہ کو اپنے سے بڑا ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ آخر کار اللہ کے وجود سے ہی انکار کر دیتا ہے۔ ایسا کب ہوتا ہے؟ جب عقل میں زیادتی ہو جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کسی چیز کا زیادہ ہونا تو اچھا ہوتا ہے لیکن اگر آپ سرطان کی بیماری ذہن میں لائیں تو یہ بات سمجھ میں آجائے کہ ہمیشہ کسی چیز کا زیادہ ہونا فائدہ مند نہیں ہوتا۔ سرطان میں کیا ہوتا ہے؟ جسم کے (cells) تیزی سے بڑھنا (multiply) شروع ہو جاتے ہیں۔ انسان کے جسم کے خلیے بڑھتے چلے جاتے ہیں تو یہ بڑھوتری فائدہ تو نہیں دیتی بلکہ سرطان بن جاتی ہے۔ اسی طرح بے مقصد عقل وغیر نافع عقل جب حد سے زیادہ بڑھنے لگ جاتی ہے تو پھر وہ ایک مرض کی صورت اختیار کرتی ہے اور کئی اخلاقی بیماریوں کو جنم دینے کا باعث ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس اگر قوتِ عقل میں بہت زیادہ کمی ہو جائے تو اس کا اظہار حماقت اور بیوقوفی (stupidity) کی صورت میں ہوتا ہے اور انسان اللہ کے ساتھ دوسری مخلوقات کو شریک کرنے لگ جاتا ہے۔ اسی طرح عقل جب کم ہوتی ہے تو انسان شرک کی طرف چلا جاتا ہے۔ اگر قوتِ عقل معتدل اور متوازن (balanced) رہے تو اس سے انسان میں حکمت و دانش (wisdom) جنم لیتی ہے۔ حکمت کا تعلق بھی فطرت سے ہے اور اس سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔

### 3۔ قوتِ غضب:

کسی اور زبان میں اس لفظ کا متبادل ڈھونڈنا ممکن نہیں ہے۔ یوں سمجھیں جیسے کہ مشین کی طاقت (horse power) ہوتی ہے، اسی طرح یہ انسان کا ایک انجن ہے، اس کا سرچشمہ طاقت (source of energy) ہے۔ اگر قوتِ غضب زیادہ ہوگی تو آدمی بات کرنے میں بہت اونچا اونچا بولے گا، بے ادب ہوگا، بڑے بڑے دعوے کرے گا، بڑھکیں مارے گا۔ ضروری نہیں کہ قوتِ غضب کی زیادتی سے انسان میں یہ ساری کی ساری خرابیاں پیدا ہو جائیں، لیکن ان میں سے کوئی ایک برائی بھی ہے تو وہ اسی قوتِ غضب کے اعتدال سے ہٹ جانے کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ قوتِ غضب کی زیادتی کی وجہ سے بڑے بڑے دعوے کرنے، بلا ضرورت خطرات میں کود پڑنے، غصہ کرنے، جلد بازی کرنے، اوروں کی بے عزتی کرنے جیسی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اور اگر اس قوت میں حد سے زیادہ کمی ہو جائے، تو کابلی ناامیدی (despondency)، بزدلی اور کم ہمتی پیدا ہوگی، خود کو حقیر جانے لگا، بے بسی کا شکار رہے گا، شکوے شکایت کرے گا، اس

کے اندر بے غیرتی پائی جائے گی۔ یہ تمام برائیاں یا ان میں سے چند یا کوئی ایک پیدا ہو سکتی ہے اور اگر قوتِ غضب میں اعتدال ہے تو انسان کے اندر غیرت، خودداری اور شجاعت جیسی خوبیاں پیدا ہوں گی۔

#### 4۔ قوتِ شہوت :

خواہشات و شہوات (appetites and desires) یہ سب ایک ہی قوتِ شہوت کے تحت آتے ہیں۔ اگر یہ قوت حد سے بڑھی ہوئی ہو تو لالچ، ہوس، بے حیائی، خیانت، بد عہدی، امیروں کے ہاتھوں ذلت اٹھانا، جو معاشرے کے کرتا دھرتا ہیں ان کے آگے خوشامد اور چا پلوسی کرنا، غریبوں (have nots) کو حقیر جاننا، غیر حقیقی توقعات (unrealistic expectations) رکھنا، اس طرح کی برائیاں پیدا ہوں گی۔

اور اگر قوتِ شہوت حد سے زیادہ گھٹ جائے تو انسان کے اندر سستی پیدا ہوتی ہے، بے چینی رہتی ہے، جھنجھلاہٹ اور مایوسی طاری رہتی ہے، انسان اعصابی دباؤ (depression) کا شکار ہوتا ہے۔ لیکن اگر قوتِ شہوت اعتدال پر ہو تو انسان کے اندر عفت پیدا ہوتی ہے، تحمل آتا ہے، شرم و حیا قائم رہتی ہے، دوسروں پر کام کو آسان کرتا ہے، غیر حقیقی توقعات نہیں رکھتا، حقیقت پسند ہوتا ہے، ہوائی قلعے نہیں بناتا، اس کے اندر ظرافت و مزاح (sense of humour) ہوتا ہے، کسی کا مذاق نہیں اڑاتا، اس کے اندر توانائی (motivation) ہوتی ہے۔ تو پتہ چلا کہ قوتِ غضب اور قوتِ شہوت کا گلائیں گھونٹنا، بلکہ ان کو معتدل بنانے اور کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے لہذا یہ قوتیں ہماری فطرت کے تابع ہونی چاہئیں۔

#### 5۔ قوتِ عدل :

قوتِ عدل کا بھی تعلق فطرت سے ہے۔ جانوروں کے اندر اس کا کوئی تصور نہیں ہے جب کہ انسانوں کے اندر عدل کا تصور ہے۔ قوتِ عدل جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، دو انتہاؤں کی درمیانی کیفیت ہے۔ عدل کی ضد ہے ظلم، چنانچہ عدل کے بارے میں انسان کا رویہ کبھی کبھی افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر انسان عدل کے بارے میں زیادہ ہی حساس (sensitive) ہے تو بہت ہی زیادہ بال کی کھال نکالے گا، بہت ہی زیادہ محتاط ہوگا۔ تو ظالموں کے ساتھ بے جا نرمی برتے گا، ان کی طرف سے غلط اور جھوٹے بہانے قبول کر لے گا اس لیے کہ عدل کے بارے میں بڑا





حساس ہوگا۔ سوچتا رہے گا کیا پتہ ایسا ہو، کیا پتہ ویسا ہو۔ لہذا ظالموں کے ساتھ نرمی برتے گا، ان کے غلط بہانے بھی مان لے گا، اور عدل کے بارے میں اگر بہت دیر لگائے گا تو بھی ظالموں کو فائدہ ہو گا۔ عدل کرنے میں تاخیر کرنا ایسا ہے جیسا عدل کو روک لینا۔ (Justice delayed is justice denied) اور اگر عدل کی طرف سے بالکل بے حس ہو، بے نیاز ہو، انتہائی غیر محتاط ہو، بہت جلد باز ہو تو بے قصوروں پر بھی شک کرے گا، بغیر ثبوت کے بھی لوگوں کو سزا دے دیگا۔ اور اگر جلد بازی کرے گا تو ہو سکتا ہے کہ بے قصوروں کو سزا دیدے۔ تو دونوں صورتوں میں وہ ظلم کا ارتکاب کرے گا۔

یہ چند باتیں ہیں کہ جن کا علم انسان کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ خود کو پہچانے۔ یہ تمام چیزیں ان شاء اللہ خود شناسی میں مددگار اور معاون ثابت ہوں گی۔ اور خدا شناسی کی طرف رہنمائی کریں گی۔

## ادب

تزکیہ دراصل ہے ہی دل کو بدلنا۔ اور عربی میں لفظ ”قلب“ کا مطلب ہوتا ہے پلٹنا۔ اگر آپ نے اپنا تزکیہ کرنا ہے تو اس کا آغاز یقیناً دل سے کرنا ہوگا، دل سے ابتدا کرنی ہوگی۔ تزکیہ کے لیے اس دل کو سب سے پہلے آداب (etiquettes) سکھانے چاہئیں کہ مختلف لوگوں، مختلف ہستیوں کے ساتھ ہمارا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔

پہلے زمانے میں جو استاد بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، ان کو مؤدب کہا جاتا تھا یعنی ادب سکھانے والا۔ وہ بچوں کو متعلقہ علوم کے ساتھ ساتھ آداب بھی سکھایا کرتے تھے۔ لہذا علم کے ساتھ ادب آنا چاہیے۔

### 1۔ اللہ کا ادب:

سب سے پہلے جس کا ادب آنا چاہیے، وہ ہے ”اللہ کا ادب۔“ اللہ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے کیا آداب ہیں، اپنے رب کے ساتھ تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے، اس پر تھوڑی سی گفتگو کر لیتے ہیں۔ (۱) اللہ تعالیٰ کے ادب کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے {لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ} {لقمن: ۱۳} ”اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔“ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کیا جائے۔ یعنی متقی (God conscious) رہا جائے، خود کو اللہ کی نظر سے جانچا جائے، اللہ کی نظر سے تولا جائے، یہ اللہ کا ادب ہے۔ اللہ اکبر! اللہ سب سے ہے۔ جو اللہ کا مقام ہے اسی پر اللہ کو رکھا جائے۔ تبھی اللہ کا ادب آئے گا اور اس کے مقام کا احساس ہوگا، نمازوں کے اندر خشوع و خضوع پیدا ہوگا۔

نماز میں اللہ کے سامنے بہت ادب کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے۔ سورۃ المؤمنون میں فرمایا:

{الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ} {المؤمنون: ۲}

”وہ لوگ (فلاح پانے والے ہوں گے) جو اپنی نمازوں میں خشیت کا مظاہرہ کرنے والے ہیں۔“

اپنے رب کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔ (۲) اللہ کے ساتھ تعلق کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ اُس کی بہت تعریف کی جائے۔ اس کی تسبیح کی جائے یعنی سبحان اللہ، اس کی تحمید کی جائے یعنی الحمد للہ اور اس کا ذکر کیا جائے۔ اللہ کے بارے میں سوچا جائے، اس کی عظمت کا تصور کیا جائے، اس کی خلاقیت





پر غور کیا جائے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ کو اپنی زندگی کا محور بنا لیا جائے، ہم اُس کے نام سے جنمیں اور اس ہی کے نام سے مریم۔

{إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحَبَّتِي وَمَسَابِقِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ} (الانعام: ۱۶۲)  
 ”بیشک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔“

یہ ہے للہیت۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

{كُونُوا رِبًّا نَبِيًّا} (آل عمران: ۷۹) ”اللہ والے بنو۔“

ایسے اللہ والے بنو کہ بس اللہ تمہارے دل پر چھا جائے، اُٹھتے بیٹھتے وہ یاد آئے اور اس سے محبت ہو۔ (۳) اللہ کے نام کا ادب کیا جائے، حتیٰ الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ اگر کسی کاغذ پر لکھا ہوا اللہ کا نام زمین پر پڑا ہوا نظر آئے تو اُسے اٹھا کر اونچی اور محفوظ جگہ پر رکھ دیں، کچرے یا روٹی میں نہ جانے پائے۔ انسان اللہ کے نام کی جھوٹی قسمیں نہ کھائے۔ جھوٹی قسم کھانا تو پھر بہت بڑی بات ہے، اللہ کے نام پر بہت زیادہ قسمیں کھانا بھی پسندیدہ نہیں۔ خاص طور پر اللہ کی قسم کھا کر کسی اچھے کام سے باز رہنا۔ کوئی اچھا کام چھوڑنے پر اللہ کے نام کی قسم کھا لینا بے ادبی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ آیت ۲۲۳ میں فرمایا:

{وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِكَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصَلُّوا بَيْنَ النَّاسِ}

”اور تم اللہ (کے نام) کو نشانہ مت بناؤ اپنی قسموں کا کہ تم نیکی نہیں کرو گے، تم تقویٰ اختیار نہیں کرو گے، تم لوگوں کے درمیان اصلاح نہیں کرو گے۔“

ایسی قسم مت کھاؤ کہ اللہ کی قسم میں زندگی بھرا اپنے بھائی سے بات نہیں کروں گا، یا فلاں شخص کو کبھی سلام نہیں کروں گا نعوذ باللہ۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

(۴) انسان بات بے بات اللہ کا نام نہ لے۔ شریعت موسوی ﷺ کے احکام عشرہ (ten)

commandments میں بھی یہ بات رقم ہے کہ لغو چیزوں کے لیے اللہ کا نام مت لیا

کرو۔ (Do not take the name of God in vain)، گناہوں پہ اللہ کا نام مت

لیا کرو۔ اللہ کا نام ادب اور شعور (consciousness) کے ساتھ لینا چاہیے۔

(۵) اللہ کے نام کا ادب یہ بھی ہے کہ اللہ کے ناموں کو اپنی دعاؤں کے لیے وسیلہ بنایا

جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا} (الاعراف: ۱۸۰)

”تمام خوبصورت نام اللہ کے لیے ہیں، تو اس کو ان ناموں سے پکارو۔“

(۶) انسان اپنی طرف سے اللہ کا نام ایجاد نہ کرے، بلکہ اللہ نے قرآن مجید میں اپنے جن

صفات نامی اسماء کا ذکر کیا ہے یا احادیث میں جو نام مذکور ہیں بس ان ہی صفاتی ناموں کے ذریعے اللہ کو پکارے۔ نبی اکرم ﷺ کی ایک دعائیں یہ الفاظ آتے ہیں:

(( لَا اُخْصِيْ تَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلَيَّ نَفْسِكَ ))<sup>(۱)</sup>

”اے اللہ میں تو میری تعریف نہیں کر سکتا، تو ایسا ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی تعریف فرمائی۔“

ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی طرف سے کوئی اچھا نام لے کر اللہ تعالیٰ کو پکاریں لیکن وہ اللہ کے شایان

شان نہ ہو، اس لیے کہ اللہ تو اکبر ہے، اللہ بہت بلند مرتبہ والا، بہت اعلیٰ ہے، ارفع ہے، وہ مہر اور

مترہ ہے، ہمارے تصورات سے بہت ماوراء ہے۔ ہم اپنے معیارات سے سوچتے ہیں اور ہمارے

معیارات بہت چھوٹے ہیں۔ اللہ کی ذات و صفات تک ہمارے وہم و گمان کی رسائی نہیں ہو سکتی،

ہمارا تخیل (imagination) بھی اللہ کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے کہ

انسان اپنی طرف سے کوئی نام یا صفت گھڑ لے یا اللہ کے بارے میں کوئی تصور قائم کر لے۔ (۷)

اللہ کا ادب یہ ہے کہ جن ناموں سے اللہ نے خود کو یاد کیا ہے انہی کو وسیلہ بنایا جائے۔ جب دل میں

اللہ کی عظمت ہوگی تو اس کا اثر عمل میں نظر آئے گا، پوری شخصیت پر اس کا اثر ظاہر ہوگا اور اس کی

صفات کی عظمت کا یقیناً احساس ہوگا۔

## 2- قرآن کا ادب:

قرآن کریم اور وہ مجلس جہاں قرآن پڑھا جا رہا ہو، دونوں کے آداب ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اللہ

تعالیٰ نے فرمایا:

{وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ} (الاعراف: ۲۰۴)

”جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو غور سے سنو اور خاموش رہو شاید کہ تم پر رحم کیا جائے۔“

یہ ہے قرآن سننے کا ادب۔ سننے سے مراد ہے اس خاص مجلس میں سنتا جہاں انسان آتا ہی

(۱) جامع الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ ﷺ





قرآن سننے کے لیے ہے۔ ورنہ اگر بیچ بازار میں تلاوت قرآن کی آواز آرہی ہے تو انسان بازار میں قرآن سننے کے لیے تو نہیں گیا۔ اب اگر وہاں کسی نے تلاوت کی کیسٹ لگا رکھی ہے تو جس نے تلاوت لگائی ہے وہ ادب سے سنے، باقی لوگ اس کے مکلف نہیں۔

اس آیت سے مراد یہ ہے کہ جب تم قرآن کی مجلس میں آؤ۔ تمہارا ارادہ ہی یہ ہو کہ تمہیں قرآن سننا ہے یا پھر تم خود اس ارادے سے کیسٹ لگاؤ کہ مجھے قرآن سننا ہے تو اب خاموش رہو اور غور سے سنو۔ جہاں قرآن پڑھا جا رہا ہو وہاں باادب بیٹھنا اللہ کی رحمت کو متوجہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ ترتیب کے بغیر نہیں بیٹھنا چاہیے، بے دلی سے نہیں سننا چاہیے، دل و دماغ دونوں کو حاضر رکھ کر سننا چاہیے۔ کیوں کہ قرآن تو نازل ہی دل پر ہوا ہے۔ اگر دل غافل رہے، بے ادب رہے تو اصلاح کا آغاز کہاں سے کریں گے۔ لہذا مؤدب بننے کا آغاز دل سے کرنا ہے، سب سے پہلے دل کو ادب سکھانا ہے۔ قرآن سنتے سنتے جمائیاں لینا، اونگھنا یا سو جانا انتہا درجے کی بے ادبی ہے۔ کسی درس وغیرہ میں جانا اور وہاں قرآن کی آیات کا درس ہو رہا ہو تو متوجہ ہو کر سننا بہت ضروری ہے۔ ذرا سوچیں ایک طرف قرآن سنایا جا رہا ہو، پڑھایا جا رہا ہو اور دوسری طرف ہم موبائل پر پیغامات (messages) بھیج رہے ہوں، پڑھ رہے ہوں یا فون پر باتیں شروع کر دیں، یہ سب کتنی بڑی بے ادبی ہے۔ مثل مشہور ہے ”باادب بانصیب بے ادب بے نصیب۔“ جو اتنی بے ادبی سے اللہ کا کلام سنے گا تو خدشہ ہے کہ وہ ہدایت سے محروم رہے، قرآن اس کے دل میں جاگزیں نہ ہو۔ اتنی لاپرواہی کے ساتھ قرآن سننے والے کو ہدایت کہاں سے ملے گی۔ تو یہ رویہ اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ اسی طرح قرآن کی مجلس میں بیٹھے ہیں، باتیں تو نہیں کر رہے لیکن کاپی پر لکھ کر ایک دوسرے کو بھیج رہے ہیں، یہ بھی انتہائی وبال کا باعث ہے اور سخت بے ادبی ہے۔

اس لیے جس حد تک ممکن ہو اپنے جسم سے، اپنی سوچ سے، اپنے دل سے اور حرکات و سکنات سے قرآن کا ادب کرنا چاہیے۔ کلام کا ادب ظاہر کرے گا کہ صاحب کلام کا کتنا ادب دل میں ہے۔ اور اللہ سب سے زیادہ اس ادب کا مستحق ہے۔

3- جناب رسول اکرم ﷺ کا ادب:

اللہ کے شرف کے بعد انسانوں کا مرتبہ آتا ہے۔ یقیناً انسانوں میں سب سے اشرف اور ارفع

نبی اکرم ﷺ ہیں۔ اس لیے سب سے زیادہ آپ ﷺ کا ادب کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے (سورۃ الحجرات: 1، 2) میں فرمایا ہے:

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْدُمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَبِيحٌ عَلَيْهِمُ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ۝}

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے نکلنے کی کوشش نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ سب کچھ سننے والا اور باخبر ہے۔ اے ایمان والو! اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے اپنی آواز بلند مت کرو اور نہ ان سے ایسے زور سے بولو جیسے تم ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال غارت ہو جائیں اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے۔“

جب نبی اکرم ﷺ کا نام آئے تو چاہیے کہ آدمی درود پڑھے۔ جب آپ ﷺ کی حدیث شریف سامنے آجائے تو خاموش ہو جائے۔ کوئی بحث مباحثہ ہو رہا ہے کسی نے کہا بھی حدیث میں یہ آتا ہے۔ تو بس بات ختم، طے (decide) ہو گیا۔ آپ ﷺ کی بات کے سامنے اپنی آوازوں کو بلند نہیں کرنا۔ نبی اکرم ﷺ کی سنتوں کا احترام کرنا ہے۔ جب آپ ﷺ کا ادب ہوگا تو آپ کے طور طریقوں کا بھی ادب ہوگا اور آپ ﷺ تو ہیں۔ ہی افضل البشر، بہترین انسان۔ آپ ﷺ تو امام الانبیاء ہیں۔ آپ ﷺ نے معراج کے موقع پر تمام انبیاء ﷺ کو نماز پڑھائی۔ خلاصہ یہ کہ ہر سنت چاہے چھوٹی ہو یا بڑی اُس کا ادب کرنا ہے۔

اور آپ ﷺ سے متعلق جتنے لوگ تھے آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، آپ ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سب کا احترام نہایت ضروری ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جب تمہارے سامنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا جائے تو ادب کے ساتھ خاموش ہو جاؤ، یعنی اُن پر طعن و تنقید مت کرو۔ آپ ﷺ کی اولاد تھی، آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، سب آپ ﷺ کو پیارے تھے۔ آپ ﷺ کی ازواج تھیں، جن کو ازواج مطہرات کہا گیا یعنی پاک بیویاں۔ لہذا آپ ﷺ کے ادب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، آپ ﷺ کی ازواج، آپ ﷺ کی اولاد، آپ ﷺ کے رشتہ دار جو ایمان لائے، اُن سب کا لازمی ادب کیا جائے، اُن کی عزت کی جائے۔ چاہیے کہ وقت نکال کر آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کا مطالعہ کیا جائے، کیوں کہ جتنا زیادہ ہم آپ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کریں گے، اتنا ہی زیادہ آپ ﷺ کا ادب بھی کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ!



## 4- انسانوں کا ادب :

آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کے بعد عام انسانوں کی باری آتی ہے۔ اُن کا ادب بھی ضروری ہے۔ جو علم میں بڑا ہو اُس کا ادب کریں، چاہے کوئی استاد ہو یا کوئی عالم ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی عمر میں بڑا نہ ہو مگر علم میں بڑا ہے، اُس کا ادب کرنا چاہیے۔

## (الف) عمر میں بڑوں کا ادب :

عمر میں بڑے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک خاندان کے بزرگ، نانی، دادی، چچا، تایا، پھوپھی، ساس، سُسر۔ یہ عمر میں بڑے لوگ ہیں، ان کا ادب کرنا نہایت ضروری ہے۔ کسی کو اجازت نہیں کہ بڑوں کے سامنے زبان چلائے۔ یہ روش پُر اعتمادی (confidence) کی علامت نہیں ہے بلکہ بدتمیزی (defiance) کی علامت ہے۔ خاندان کے بزرگوں کا ادب لازمی ہے۔ یعنی ان سے جھک کر ملا جائے، اُنہیں سلام کیا جائے، کوئی بات اُن کے سامنے ایسی نہ کی جائے جس سے وہ اپنی بے عزتی اور بے ادبی محسوس کریں۔

دوسرے وہ عمر رسیدہ لوگ جو خاندان کے بزرگ یا رشتہ دار نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے ملازم ہوں، ڈرائیور، آیا، خاناماں، چوکیدار یا جھاڑو پونچھا کرنے والے ہوں۔ اگر یہ ملازمین عمر میں بڑے ہیں تو اُن کا ادب کرنا چاہیے۔ حدیث رسول ﷺ میں آتا ہے:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَزَحْمِ صَغِيرًا وَيُوقِرْ كَبِيرًا))<sup>(۱)</sup>

”وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور وہ ہمارے بڑوں کی تعظیم نہیں کرتا۔“

## بچوں کو خاد میں ادب کرنا سکھائیے :

اپنے بچوں کو سکھائیے کہ نوکروں کا ادب کریں کیوں کہ وہ اُن سے بڑے ہیں۔ اُنہیں ”آپ“ کہہ کر مخاطب کرنا ہے۔ بچے عمر میں چھوٹے ہوتے ہیں اور ملازمین عام طور پر عمر میں اُن سے بڑے ہوتے ہیں۔ لہذا اُنہیں سکھائیں کہ ملازمین سے تحکمانہ لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔ بچے نوکروں کو خود سلام کریں، اس لیے کہ چھوٹے بڑوں کو سلام کرتے ہیں تو جہاں خاندان کے بزرگوں کو سلام کرنا ہے وہاں گھر کے نوکروں کو بھی سلام کرنا لازمی ہے۔ اس لیے کہ ملازمین کی بھی

(۱) مسند احمد، باقی مسند المکثورین، مسند أبي سعيد الخدري رضي الله عنه

عزت ہوتی ہے۔ وہ بھی عزت چاہتے ہیں۔

جب ہم چاہتے ہیں کہ بڑے ہماری اطاعت کریں، ہمارا کہنا مانیں تو ہم خواہ مخواہ اپنے آپ کو پریشان کرتے ہیں۔ بلاوجہ کا بوجھ اپنے اوپر لاد لیتے ہیں۔ اللہ نے ہم پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی کہ ہم سب کو اپنا مطیع بنا سکیں۔ بعض دفعہ فرمانبرداری کرنا، کسی کی بات ماننا، احکام بجالانا ہمیں بہت پرسکون کر دیتا ہے، ہلکا کر دیتا ہے۔ اگر ہمیں اچھا معیار زندگی (quality of life) چاہیے تو ہم ادب کر کے دیکھیں۔

(ب) عہدے میں بڑوں کا ادب:

پھر جو عہدے میں بڑا ہو اس کی بھی عزت کرنی چاہیے کیوں کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک باعزت مقام عطا کیا ہے۔ مثلاً ملک کا سربراہ، کسی ادارے کا سربراہ، جج، مسجد کا امام یا کوئی استاد ایسے تمام افراد کی عزت کرنی چاہیے۔

(ج) رتبے میں بڑوں کا ادب:

بعض لوگ رتبے میں بڑے ہوتے ہیں جیسے والدین۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بہت بڑا رتبہ دے رکھا ہے۔ اسی طرح مالک ہو سکتا ہے کہ عمر میں چھوٹا ہو لیکن اللہ نے اسے ایک مقام عطا کیا ہے کہ اسے مالک بنا دیا تو جو ماتحت ہیں وہ مالک کا ادب اور اس کی عزت کریں۔ ادب میں لازماً یہ بات داخل ہے کہ جو بڑے ہیں، چاہے علم میں ہوں یا عمر میں، عہدے میں ہوں یا مرتبے میں، اُن کا ہرگز مذاق نہ اڑایا جائے۔ ہمارے ہاں جو رواج چل پڑا ہے کہ عہدے میں بڑے لوگوں کے مزاحیہ کردار (caricature) بنائے جاتے ہیں، اُن کی کردار کشی کے لیے لطیف گھڑے جاتے ہیں، یہ بڑی بے ادبی کی بات ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں جو کہ آئیڈیل اسلامی معاشرہ تھا، ہمیں اس طرح کی باتیں نہیں ملتیں۔ کوئی کسی کا اس طرح مذاق نہیں اڑایا کرتا تھا، مذاق اڑانے سے تحقیر ہوتی ہے، بے عزتی ہوتی ہے جو کہ ادب کی ضد ہے۔ لیکن ہمارے ہاں میڈیا نے یہ رواج (culture) اپنا لیا ہے کہ ملک کے صدر کا مذاق اڑایا جائے، وزیروں کا مذاق اڑایا جائے، یا ادارے کے سربراہوں کا مذاق اڑایا جائے اور اس سے لطف اندوز ہوا جائے۔

علم ادب کے ساتھ آتا ہے، یا یوں کہہ لیں کہ علم کے ساتھ ادب آنا چاہیے۔ دونوں چیزیں لازم اور ملزوم ہیں۔ علم اور ادب یا ادب اور علم۔ اگر علم نہیں ہے تو ادب کرنا نہیں آئے گا۔



ادب کے لیے کھڑا ہونا ضروری نہیں:

ہمارے معاشرے میں بڑوں کے ادب کے ضمن میں معروف ہے کہ جب وہ آئیں تو ان کے احترام میں کھڑا ہوا جائے، یہ لازمی نہیں ہے۔ یہ بھی ہمارے ہاں ایک غلط رواج چل پڑا ہے کہ بڑے جب آئیں تو کھڑا ہوا جائے۔ جب کہ اسلام کے مطابق اگر کسی بڑے کے لیے کھڑے نہ ہوں تو یہ بے عزتی یا بے ادبی کی علامت نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی انسان آنے والے کے لیے خود کھڑا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ کھڑا ہونا واجب نہیں ہے لیکن کوئی گناہ بھی نہیں ہے، کوئی کھڑا ہو جاتا ہے تو ہو جائے، نہیں ہوتا تو بے ادبی میں شمار نہیں ہوتا۔ نبی اکرم ﷺ کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ جب آپ ﷺ تشریف لائیں تو لوگ آپ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے زیادہ کوئی اور ہمیں محبوب نہ تھا لیکن ہم آپ ﷺ کو دیکھ کر اس لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے کہ آپ ﷺ پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَمْشَلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَّبِعُوا أَمَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ))<sup>(۱)</sup>

”اگر کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ میرے آنے پر لوگ کھڑے ہو جائیں اور میں بیٹھوں تو لوگ میرے سر ہانے کھڑے رہیں تو وہ جہنم میں داخل ہونے کی تیاری کر لے۔“  
یہ ”انا“ کی بگڑی ہوئی شکل ہے کہ انسان کو اچھا لگے کہ لوگ میرے لیے کھڑے ہو جائیں، مستعد (alert) ہو جائیں۔ لیکن اگر کوئی خود اپنی خوشی سے کسی کے ادب و احترام کی خاطر کھڑا ہونا چاہتا ہے تو کوئی حرج بھی نہیں۔

(د) کسی قوم کے بڑے کا ادب:

حدیث رسول ﷺ میں آتا ہے: ”جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز مہمان آئے تو تم اس کا اکرام کرو۔“ یعنی عزت اور احترام کرو۔ کسی ایسے انسان کی بے عزتی نہیں کرنی چاہیے جو اپنی قوم میں باعزت سمجھا جاتا ہو۔ اگر کوئی کافر اپنے معاشرے میں باعزت سمجھا جاتا ہے اور وہ مسلمانوں کے پاس ان کی محفل میں آتا ہے تو اس کافر کی عزت ہونی چاہیے۔ یہ حدیث ہمیں آداب سکھا رہی ہے۔ ایسے شخص کی بے عزتی نہیں کی جائے گی، نہ اس کا مذاق اڑایا جائے گا اور

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی قیام الرجل للرجل

نداس کی تحقیر کی جائے گی۔

آج بے ادبی کا کلچر عام ہے:

آج آپ دیکھیں کہ بے ادبی کرنا دنیا کا رواج (culture) بن گیا ہے۔ ہر ایک کی بے ادبی کی جاتی ہے، ہر ایک پر جملے کسے جاتے ہیں، ہر ایک کا مذاق اڑایا جاتا ہے، طنز کیا جاتا ہے یہاں تک کہ ان کی برائیوں کو اچھا کر ان پر کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ یہ عبث کام ہے اور مغرب کی تقلید ہے، وہاں تو پیغمبروں کو بھی نہیں چھوڑا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی معزز اور محترم ہستیوں پر مزاحیہ فلمیں بنائی گئی ہیں۔ گویا نعوذ باللہ ان عظیم پیغمبروں کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔

بڑوں کا ادب کیسے ہو:

اسلام ہمیں ادب سکھاتا ہے کہ جب بڑے بات کریں تو بیچ میں بات نہ کاٹی جائے۔ بلکہ بات مکمل ہو جانے کے بعد اظہارِ خیال کیا جائے۔ بعض دفعہ معمر افراد ٹھہر ٹھہر کر اور دُہرا دُہرا کر بات کرتے ہیں، ان کی بات صبر سے سنی جائے، بات مکمل ہونے کا انتظار کیا جائے۔ مکہ میں ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ تشریف رکھتے تھے کہ اتنے میں ولید بن مغیرہ آیا اور اُس نے نبی اکرم ﷺ سے بات شروع کی کہ ”بھتیجے تم نے یہ کیا کیا! مکہ کے گھر گھر میں فساد برپا کر دیا! تم نے ہمارے معبودوں کو بُرا بھلا کہا“ اور اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔ نبی اکرم ﷺ اس سے عمر میں چھوٹے تھے، مگر رُتے میں کتنے بڑے تھے، آپ ﷺ اللہ کے کتنے پیارے رسول تھے اور وہ اللہ کا دشمن تھا، لیکن آپ ﷺ نے اس کی بات نہیں کاٹی بلکہ صبر اور خاموشی سے سنتے رہے اور پوری بات سنی۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی بات کہہ چکا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”ابو ولید آپ کی بات مکمل ہوگئی؟“ اس نے کہا ”جی ہاں ہوگئی“ اس کے بعد آپ ﷺ نے اس کی بات کا جواب دیا۔

تو اسلام ہمیں آداب (manners) سکھاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا چھوٹوں کا تکبر ہے کہ وہ بڑوں پر ہنسنا شروع کر دیں کہ پتہ نہیں کیا بولے چلے جا رہے ہیں؟ بار بار ایک ہی بات دہرائے چلے جاتے ہیں۔ یہ بھی بے ادبی ہے۔ بڑوں کی بات مکمل ہونے کا انتظار کریں، توجہ سے سُنیں۔

اسی طرح بڑوں کے ادب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انہیں دُور سے مخاطب نہ کیا جائے بلکہ قریب جا کر بات کی جائے اور شناسگی کے ساتھ نرم لہجے میں گفتگو کی جائے۔ یہ زیادہ مناسب طرزِ عمل ہے اور یہ اسلامی تہذیب جو سنتِ نبوی ﷺ کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے، اس میں بھی پسندیدہ ہے۔

بڑوں کے قریب جا کر آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے بات کرنے کی ہدایت عام حالات میں



ہے، ہنگامی صورتحال (emergency) کے دوران نہیں۔ غیر معمولی حالات میں آواز بڑھائی جاسکتی ہے۔ ایک اور بات جو بڑوں کے ادب میں آتی ہے وہ یہ کہ بڑوں سے بحث نہ کی جائے۔ اگر وہ غلطی پر ہیں اور بات نہیں سمجھ پارہے تو اُن کے لیے دعا کر کے انسان خاموش ہو جائے، ان سے الجھنا صحیح نہیں ہے، تنقیدی انداز سے گریز کرنا چاہیے۔

شریعت کے دائرے کے اندر اندر رہتے ہوئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ اُن کی بات مانی جائے، ادب کے ساتھ اطاعت لازم ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی کا ادب کیا جائے اور اس کی بات نہ مانی جائے؟

### اسلاف میں علماء اور اساتذہ کی عزت:

ایک واقعہ ہے کہ ایک بار حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ایک جنازے میں شرکت فرمائی۔ نماز جنازہ کے بعد آپ رضی اللہ عنہ کی سواری کے لیے ایک خچر لایا گیا تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے جھٹ آگے بڑھ کر رکاب تھام لی۔ یہ دیکھ کر حضرت زید رضی اللہ عنہ ذرا ٹھکے اور فرمایا اے میرے آقا کے ابن عم! میری سواری کی رکاب تھام کر آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کون تھے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے، اس لحاظ سے ان کا بڑا مقام تھا۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اطمینان سے بیٹھیے علمائے دین کی اسی طرح عزت کرنی چاہیے۔

اسی طرح ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید نے اپنے بیٹے سے کہا کہ تم اپنے استاد کی جوتیاں اٹھایا کرو۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ اُستاد مجلس سے اُٹھ کر جاتے یہ شہزادہ دوڑ کر استاد کی جوتیاں اٹھالیتا تھا، اس قدر استاد کی عزت ہوا کرتی تھی۔

ایک دفعہ ہارون رشید آیا اور اس نے دیکھا کہ اُستاد صاحب وضو کر رہے ہیں اور شہزادہ پانی ڈال رہا ہے اور وہ اپنے ہاتھ سے پاؤں مل رہے ہیں تو خلیفہ ہارون ناراض ہوا اور اپنے بیٹے سے کہنے لگا کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ ایک ہاتھ سے تو پانی ڈالتا اور دوسرے ہاتھ سے اُستاد کا پاؤں دھوتا۔

یہ اسلام کا معیار ادب ہے۔ آپ خود تصور کریں وہ معاشرہ کتنا خوش گوار ہوگا کہ جہاں اساتذہ کی ایسی عزت ہوتی ہوگی، کیا بلند اور پاکیزہ اخلاق ہوں گے۔

ادب اور حکم میں تصادم:

حکم کی بجا آوری اور ادب دونوں بہت ضروری ہیں، لیکن اگر کبھی صورت حال ایسی بن جائے

کہ بڑوں کا ادب اور حکم آپس میں متصادم (clash) ہو جائیں اور متضاد ہوں تو آیا ادب کا خیال رکھا جائے گا یا حکم ملحوظ رکھا جائے گا؟ تو قانون یہ ہے۔ ”الْأَمْرُ فَوْقَ الْأَدَبِ“ یعنی حکم کو ادب پر فوقیت دی جائے گی۔ تعظیم کا تقاضا ہے کہ جب کوئی بڑا کسی بات کا حکم دے، چاہے اُس پر عمل کرنا ادب کے خلاف معلوم ہو رہا ہو، ایسی صورت میں حکم کی فوقیت ہوگی، حکم مانا جائے گا۔ مثلاً کچھ لوگ کسی بزرگ کا ہاتھ ادب کی وجہ سے چومنا چاہتے ہیں لیکن بزرگ کو پسند نہیں کہ کوئی میرا ہاتھ چومے۔ انہوں نے اس سے منع کر دیا تو پھر نہیں چومنا۔

یا بعض دفعہ لوگ ادب کی وجہ سے کسی کا سامان اٹھانا چاہتے ہوں یا اُستاد کی عزت میں ان کی جوتیاں سیدھی کرنا چاہتے ہوں، لیکن استاد کو نہیں پسند، وہ نہیں چاہتے کہ کوئی میرا سامان اٹھائے یا میری جوتیاں سیدھی کرے اور انہوں نے ایسا کرنے سے منع بھی کر دیا تو ادب کا تقاضا ہے کہ حکم مانا جائے اور اس عمل سے باز رہا جائے۔

شا جہاں کے دو بیٹے عالمگیر اور داراشکوہ بادشاہت کے خواہاں تھے۔ ایک دفعہ یہ دونوں باری باری ایک ہی بزرگ کے پاس گئے کہ وہ اُن کے لیے بادشاہت کی دعا کریں۔ پہلے داراشکوہ گئے۔ بزرگ تخت پر بیٹھے تھے داراشکوہ جا کر تخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ انہوں نے داراشکوہ سے کہا میرے پاس آ جاؤ تو داراشکوہ نے جواب دیا کہ میری مجال نہیں کہ میں آپ کے برابر میں تخت پر بیٹھ جاؤں۔ بزرگ کے اصرار کے باوجود نہیں مانے اور نیچے ہی بیٹھے رہے۔ اس کے بعد عالمگیر آئے۔ وہ بھی نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ بزرگ نے ان سے بھی یہی فرمایا کہ میرے پاس تخت پر آ جاؤ۔ جب بزرگ کا حکم ہوا تو عالمگیر فوراً اُٹھ کر تخت پر اُن کے پاس جا بیٹھے۔ اُن کے جانے کے بعد بزرگ نے فرمایا کہ دونوں بھائیوں نے اپنا فیصلہ خود ہی کر دیا۔ داراشکوہ کو تخت پیش کیا گیا اُس نے انکار کیا، عالمگیر کو پیش کیا گیا اس نے قبول کر لیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو حکم دیا جائے وہ مان لینا چاہیے، چاہے اس سے ادب میں کمی آ رہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ شاگرد یا ماتحت وغیرہ ادب کی وجہ سے یا تعظیم کی وجہ سے کوئی کام کر رہے ہوں اور اُستاد یا عمر میں بڑا یا رتے میں بڑا وہ اُس چیز سے گھٹن محسوس کر رہا ہو، اُس کو پریشانی ہو رہی ہو، بے اطمینانی (uncomfortable) محسوس کر رہا ہو تو پھر انسان ایسا کرنے سے باز آ جائے۔ کسی نے کہا ہے:

عشق تسلیم و رضا کے ما سوا کچھ بھی نہیں  
وہ وفا سے خوش نہ ہوں پھر وفا کچھ بھی نہیں



اگر ان کو وفا نہیں چاہیے، وفا سے خوش نہیں تو پھر ایسی وفا سے کیا فائدہ۔ اسی طرح ایسے ادب کا کیا فائدہ جو دوسرے کو پریشانی اور الجھن میں مبتلا کر رہا ہو۔

جب بڑوں کا صحیح معنی میں ادب ہوگا تو ساتھ ہی ان کے احکامات کا بھی ادب ہوگا۔ جو بڑے حضرات احکامات دیتے ہیں انہیں ہم قانون بھی کہہ سکتے ہیں۔ بڑے حضرات قوانین بناتے ہیں اور ان کے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے احکامات کو بے چون و چرا مانا جائے۔

### (ر) قوانین کا احترام:

اگر ہم حکومت کا ادب کریں گے تو حکومت کے قانون کا بھی ادب کریں گے، مثلاً اشارہ (signal) نہیں توڑیں گے اس لیے کہ یہ بھی ایک طرح کی بے ادبی ہے کہ قوانین کو جب چاہے پامال کر دیں۔ اسلام نے تو قانون کا ادب کرنے کا حکم دیا ہے اور جو قانون کا ادب کرے گا وہ اپنے لیے اصولوں میں تبدیلی نہیں چاہے گا کہ میری وجہ سے فلاں قانون تبدیل کر دیا جائے یا یہ کہ یہ قوانین سب کے لیے ہیں مگر میرے لیے نہیں۔ دراصل یہ بھی انا کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے کہ کوئی خود کو قانون سے بالاتر سمجھ بیٹھے، جب کہ دیگر لوگ ان کا احترام کرنے والے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اتنا اہم سمجھے کہ سب قوانین میری آسانی (convenience) کے لیے ہیں اور میری ذات کے ارد گرد گھومتے ہیں اور صرف میرے فائدے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جن کی ”انا“ متوازن ہے وہ قوانین میں تبدیلی نہیں چاہتے بلکہ اپنے آپ کو مقید (bound) محسوس کرتے ہیں۔ جب قانون کا ادب اور احترام ہو تو قانون کی خلاف ورزی بھی نہیں ہوگی۔ شریعت کیا ہے؟ اللہ کا دیا ہوا قانون ہے، حدود (boundries) ہیں۔ اللہ کا ادب ہوگا تو شریعت کا ادب ضرور ہوگا، انسان کے دل میں اس کا لحاظ ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ ایک حدیث میں یہ مضمون بیان فرماتے ہیں کہ

((مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الْقَرَسِ عَلَى آخِيتِهِ يَجُولُ ثُمَّ يَزِجُ الْعَالِي آخِيتِهِ))<sup>(1)</sup>

”مومن کی مثال ایک گھوڑے کی سی ہے جو کہ بندھا ہوا ہے جتنی رسی اجازت دیتی ہے اتنا وہ

گھوڑا چرچک لیتا ہے۔ اس رسی کی لمبائی کے اندر اندر رہ کر گھوم پھر لیتا ہے۔“

مثال کے طور پر ایک گھوڑا ایک میٹر کی رسی سے بندھا ہوا ہے اب گھوڑے کا دل چاہے گا تو آدھے میٹر پر بیٹھ جائے، پون میٹر پر چلا جائے وہیں بیٹھے، چرے، سو جائے، لیکن رہے گا وہ ایک

(1) صحیح البخاری، کتاب الأحکام، باب کیف ینایع الإمام التمس

میٹر کے دائرے کے اندر اندر ہی، یہ حدود پامال نہیں کرے گا۔ مومن کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ شریعت کے دائرے کے اندر اندر رہتا ہے، قانون توڑ کر پھلانگتا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: {تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا} (البقرة: ۲۲۹) ”یہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں انہیں مت پھلانگنا۔“ انسان خود کو پابند محسوس کرے، مادر پدر آزاد نہیں ہے، یہاں تک کہ ایک آیت کے مطابق ان حدود کے قریب بھی پھلکانا چاہیے۔ جب اپنے آپ کو پابند کر لے گا تو قوانین کے بارے میں شکایتیں بھی پیدا نہیں ہوں گی۔

### قانون کے فوائد:

قانون بنانے کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے اجتماعیت حاصل ہوتی ہے، اجتماعی کام آسان ہو جاتے ہیں اور سب کے ساتھ برابری کا سلوک (treatment) کیا جاتا ہے، سب سے برابری کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو قانون کا پابند بناتا ہے تو اس میں اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے یعنی قانون کی پابندی سے بہت سی مثبت خوبیاں ابھرتی ہیں۔ اگر قانون فائدہ مند چیز نہ ہوتا تو ازل سے ہی اس کا وجود نہیں ہوتا۔ یہ تو انہیں انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔ اللہ نے بھی شریعت کی شکل میں قوانین دیئے ہیں اور انسان بھی معاملات کو چلانے کے لیے قوانین بناتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے ادارے کے بھی کچھ قواعد و ضوابط ہوتے ہیں۔ گویا کہ انسانی معاشرے کے لیے ترتیب قانون ایک امر ناگزیر ہے۔ اور اس سے بہت سی مثبت صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں۔ عزم (commitment) پیدا ہوتا ہے، اطاعت کا جذبہ ابھرتا ہے، قربانی کا جذبہ پروان چڑھتا ہے، صبر و استقلال پیدا ہوتا ہے۔ انسان کی انا اپنے مقام پر قائم رہتی ہے اور ایسے معاشرے کا ہر فرد ایک منظم فرد بن جاتا ہے۔ مساوات کی فضا پیدا ہوتی ہے اور پھر جو انسان اپنے آپ کو قانون کی اطاعت اور پیروی کا عادی کر لیتا ہے تو مشکلات اور دقت کے باوجود وقت پر کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کی عظیم الشان فتوحات، جن کا نقطہ آغاز غزوہ بدر تھا، یہ عظیم کامیابیاں تنظیم و اطاعت کے بدولت حاصل ہوئیں۔

اسی طرح قانون کا ادب کیا ہے؟ قانون کا ادب یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ کہا جاتا ہے: (Rules are made to be obeyed not to be broken) ایسے قانون کا کیا فائدہ جسے ہر شخص توڑنے پر کمر بستہ ہو۔ اُس قانون کا نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی کوئی



برکت ہے۔ معاشرے کے کچھ لوگ اگر قانون توڑتے ہیں تو باقیوں میں غم و غصہ پیدا ہوتا ہے، جس کا نتیجہ انتشار (anarchy) کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس لیے قانون کو برقرار رکھنے کے لیے اور اس کے ثمرات اور برکات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ 99.99 فیصد لوگ اس پر عمل کریں۔ خود کو پرسکون رکھنے کے لیے بھی قانون کا ادب نہایت ضروری ہے ورنہ انسان جھنجھلاہٹ میں مبتلا رہتا ہے۔ ماحول میں امن و سکون کے بجائے تنازعہ (conflict) کی فضا رہتی ہے۔ اگر قانون کا ادب اور اطاعت نہ کی جائے تو ہر وقت ٹکراؤ، بدگمانی اور غصے کی کیفیت رہتی ہے۔ جس کے نتیجے میں امور کی انفرادی اور اجتماعی کیفیت شدید متاثر ہوگی۔

اسلام میں پابندی، اطاعت اور نظم و نسق:

اسلام کے جملہ انفرادی و اجتماعی احکام میں ہمیں ایک نظم و ضبط کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ نماز میں صفوں کی درستگی بھی لوگوں کے اندر نظم پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ میدان جنگ ہو یا جماعت نماز ہو مسلمانوں کو صفیں درست کرنے کی عادت ڈالی گئی۔ جب نبی اکرم ﷺ کا انتقال ہوا تو لوگ صفیں بنا بنا کر حجرے میں جاتے، نماز جنازہ پڑھتے اور باہر نکل آتے تھے۔ تمام لوگ منظم اور پرسکون رہے۔ کوئی ہڑ بونگ نہیں مچی، نہ دھکم پیل ہی ہوئی کہ لوگ پیروں تلے روندے جا رہے ہوں۔ ایسا کچھ نہیں تھا۔ ان کو ایسی اطاعت کی، قانون کی پابندی (discipline) کی عادت پڑ گئی تھی۔

نبی اکرم ﷺ جو لوگوں سے بیعت لیا کرتے تھے اس کے الفاظ بھی نظم و ضبط کی اعلیٰ مثال ہیں۔

((بَايَعْنَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْمَنْشَطِ

وَالْمَكْرَهُ وَأَنْ لَا نَنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ وَأَنْ نَقُومَ أَوْ نَقُولَ بِالْحَقِّ حَيْثُمَا كُنَّا لَا

نَخَافُ فِي اللَّهِ لَوْمَةً لَّائِمَةً))<sup>(۱)</sup>

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے بیعت کی رسول اللہ ﷺ سے کہ ”ہم حکم سنیں گے اور مانیں گے (مسلمانوں کو قانون پر تنقید کی عادت نہیں تھی، قانون کو ماننے کی عادت تھی) خواہ مشکل ہو خواہ آسانی ہو، خواہ ہماری طبیعت کو خوش گوار لگے خواہ ناگوار لگے، خواہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے، اور جس کو بھی ہم پر امیر بنایا جائے گا ہم اس سے جھگڑیں گے نہیں اور ہم حق کہتے رہیں گے جہاں بھی ہوں اور اللہ کے معاملے میں حق کہنے سے ہم ہرگز نہیں ڈریں گے، نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو خاطر میں لائیں گے۔“

(۱) جامع الترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء في رحمة الصبيان

یہاں غور کریں کہ ہر نقطے پر کتنا زور ہے، چاہے دل چاہے یا نہ چاہے۔ چاہے خوش اور راضی ہوں چاہے ناخوش اور ناراض ہوں، مشکل ہو یا آسانی ہو، ہم اطاعت کریں گے۔

تو اسلام مسلمانوں کا اعتراض والا (challenging) مزاج نہیں بناتا، ہر چیز کو رد کرنے مت کھڑے ہو جاؤ۔ ہر قانون کی اصلاح (correction) کی ذمہ داری اپنے سر مت لو۔ جب انسان قانون کی اصلاح کی فکر میں لگ جاتا ہے تو وہ اطاعت نہیں کرتا، وہ کہتا ہے کہ قانون درست ہی نہیں ہے اس کی اطاعت کیا کریں۔ تو قانون پر تنقید کرنا بھی بے ادبی کا ایک مظہر ہے۔ سورۃ النور آیت نمبر ۶۲ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَاِذَا كَانُوْا مَعًا عَلٰى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَأْذِنُوْا }

”بے شک مومن وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر اور جب وہ ان کے ساتھ کسی اجتماعی معاملے میں ہوں جب تک اجازت نہ ملے، نہیں جاتے۔“

اگر کوئی غیر معمولی صورت حال پیدا ہوگئی ہے تو آپ ﷺ سے اجازت مانگتے ہیں اس کے بغیر نہیں جاتے۔

سورۃ النساء آیت ۵۹ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

{ يَاۡلَيْهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَاُوْلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ }

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اللہ ﷺ کی اور اطاعت کرو ان لوگوں کی کہ جو تمہارے معاملے کا اختیار رکھتے ہیں۔“

جن کے پاس کوئی عہدہ، کوئی رتبہ، کوئی مرتبہ ہے اور انہوں نے کوئی قانون بنایا ہے تو اس کی اطاعت کرنی ہوگی۔ دراصل اطاعت کرنا انا کو بہت ناگوار گزرتا ہے۔ جس کی انا حد سے بڑھی ہوئی ہے اس پر اطاعت سے بھاری اور کوئی چیز نہیں ہوتی لیکن جب انسان اپنی انا کو قابو کرتا ہے تو وہ با ادب ہو جاتا ہے، اطاعت گزار ہو جاتا ہے، ادب کرنے کی اُس کو عادت ہو جاتی ہے، تو انہیں کا ادب کرتا ہے۔ اور پھر یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی جذباتی یا غیر معمولی صورت حال پیدا ہو جائے تو ادب کی عادت انسان کے کام آتی ہے۔

عاد توں کو فطرت کے قریب کیا جائے:

فطرت اور جہلت میں سے ادب کا تعلق فطرت سے ہے۔ ہم سمجھ چکے ہیں کہ جانوروں کے



اندر فطرت نہیں ہوتی بلکہ صرف جبلت ہوتی ہے جب کہ انسانوں میں فطرت بھی ہوتی ہے۔ اور اسی فطرت اور جبلت کے امتزاج (combination) سے عادتیں وجود میں آتی ہیں۔ تو کیوں نہ ہم اپنی عادتوں کو فطرت کے قریب لے جائیں۔ یہ چیز انسان کو بہت فائدہ دیتی ہے اور کڑے وقت میں انسان کو سنبھال لیتی ہے۔ سیرت النبی ﷺ میں اس کا مظاہرہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ملتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں کو اطاعت کرنے کی عادت تھی لہذا اس عادت نے مسلمانوں کو اس آزمائش کے موقع پر فساد سے بچا لیا۔ صلح حدیبیہ کی شرائط سے مسلمان بالکل خوش نہیں تھے، لیکن نظم و ضبط (discipline) کی عادت تھی اسی لیے اس کٹھن وقت میں بھی اطاعت کر گئے۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح آیت نمبر ۲۶ فرمایا ہے:

{ اِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَبِيَّةَ الْحَبِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةَ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى }

”اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، انہوں نے اپنے دلوں میں جاہلی حمیت بٹھالی، وہ جوش اور جذبات میں بے قابو ہو گئے تو اللہ نے سکینت نازل فرمائی اپنے رسول ﷺ پر اور مومنوں پر اور اللہ نے چپکا دیا ان کے ساتھ تقویٰ کی بات کو۔“

اس بھلی عادت کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تقویٰ اور احسان کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے، درحقیقت تقویٰ بغیر ادب کے نہیں آسکتا۔

”ادب“ اور ”احترام“ :

لفظ ”ادب“ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ظاہری اعتبار سے اور معنوی اعتبار سے۔ یعنی ادب کا ایک تعلق جسمانی حرکات سے ہے اور دوسرا تعلق دل کی کیفیت سے ہے۔ ان دونوں کے لیے ہم دو مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی ادب اور احترام۔ ”ادب“ کا تعلق ظاہری رویہ (etiquette) سے ہے اور احترام کا تعلق قلب سے ہے۔

ابھی تک ہم نے ادب کے موضوع پر بات کی ہے، اب احترام پر ذرا روشنی ڈالتے ہیں۔ لفظ ”احترام“ بنا ہے حرمت سے جس کے معنی ہیں کسی چیز کی عظمت کی وجہ سے اس کی تعظیم کرنا۔ اگر دل کے اندر عزت و احترام (respect) ہے تو خود بخود احترام چھلکے گا۔ اصل ادب تو یہ ہے کہ دل میں بھی احترام ہو اور جسم کی حرکات و سکنات سے بھی اس کا اظہار ہو، نہ کہ دکھا دیا یا بناوٹی عزت و احترام۔

ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ انسان ہر ایک کا دل سے احترام نہیں کر سکتا۔ جن لوگوں کا ادب کرنے کا تقاضا ہوتا ہے بعض دفعہ دل میں ان کا احترام نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ ایسے وقت میں انسان کیا کرے؟ ایسے وقت میں انسان کو مناسب رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اور دل میں کسی شخص کے لیے احترام نہیں ہے تو کم از کم رویے سے اس کا اظہار نہ ہو، اس سے کم از کم معاشرے میں امن رہتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی مہمان آتے ہیں۔ مہمانوں کا ادب اور حق یہ ہے کہ خوش دلی سے اُن کا استقبال (welcome) کیا جائے، خوش آمدید کہا جائے۔ لیکن اگر کچھ ایسے لوگ آجائیں جن کا دل میں احترام نہیں ہے، جنہیں دیکھ کر زیادہ خوشی نہیں ہوئی لیکن ایک عادت ہے کہ ملنے والوں سے مسکرا کر ملنا ہے، یہ فطرت (nature) بن گئی ہے تو ہم اُن سے عادتاً مسکرا کر بات کریں گے، اُن سے اچھی طرح سے پیش آئیں گے، اپنی حرکات اور سکنت سے ظاہر نہیں کریں گے کہ ان کا آپنا پسند نہیں آیا۔ بچپن سے ہمیں جو آداب سکھائے جاتے ہیں وہ ہمارے بہت کام آتے ہیں۔ پھر ہم دوسروں کو اُن کا مقام تو کم از کم دے ہی دیتے ہیں، بے عزتی نہیں کرتے۔ جو کچھ سکھایا گیا ہے، جس کی تربیت ہو چکی ہے وہی رویہ غیر شعوری طور پر سرزد (reflex action) ہوتا ہے۔

بچوں کو عادت ڈالنی چاہیے کہ بڑوں کے سامنے زبان درازی نہ کریں اور نہ ان کو پلٹ کر جواب دیں۔ جب یہ عادت گھٹی میں ڈال دی جاتی ہے تو پھر زندگی میں ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ رہنا آسان ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار لڑکیوں کو ایسے سسرالیوں سے واسطہ پڑتا ہے، جہاں کچھ لوگ اچھے نہیں لگتے تو انسان اپنا رویہ مناسب رکھ کر بہت ساری تلخیوں سے بچ جاتا ہے، بے ادبی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ جو لوگ بڑوں کو منہ در منہ جواب نہیں دیتے انھیں بعد میں پشیمان نہیں ہونا پڑتا۔ اور پچھلے دور میں یہ بہت بڑی خاصیت سمجھی جاتی تھی۔ اب یہ معیار بدل دیا گیا ہے اور بے ادبی کو اعتماد کہہ دیا گیا ہے۔ بدتمیزی کو خود اعتمادی (confidence) کہہ دیا گیا ہے تو معاملات بھی تپٹ ہو گئے۔ جب کوئی بدتمیز اور بے ادب ہو اور اس کی اسی وجہ سے عزت ہونے لگ جائے، ان کمزوریوں یا برائیوں کو اچھے اچھے نام دے دیئے جائیں تو پھر لوگ کسی کا بھی ادب نہیں کرنا چاہیں گے لہذا ادب کرنا ضروری ہے۔

ادب کرنا بے چارگی، کمزوری یا بزدلی کی علامت نہیں ہے۔ ادب وہی لوگ کرتے ہیں جن کے اندر بھرپور طاقت ہوتی ہے اور جو اندر سے بااعتماد ہوتے ہیں، ورنہ زبان تو سب کے پاس ہے



اور اس کو چلانا بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن انسانیت یہ ہے کہ انسان زبان اپنے قابو میں رکھے۔ ورنہ اگر اس کو قابو میں نہ کیا تو ہم جانوروں کی سطح پر گر جائیں گے، کیوں کہ جانور ایک دوسرے پر غرأتے ہیں، ادب نہیں کرتے۔ یہ بد تمیزی اور بے ادبی تو جانوروں کی عادت ہے کہ گوشت کے ٹکڑے کی خاطر ایک دوسرے پر غرأتے ہیں، حملہ کرتے ہیں، چھینا جھپٹی کرتے ہیں۔ زبان درازی کی عادت انسانی معاشرے میں نہیں ہونی چاہیے۔

استاد کے آگے زبان درازی کرنا، شکلیں بنانا، پیٹھ پیچھے ان کا مذاق اڑانا، یا صدرِ مملکت کا مذاق اڑانا، یا ماں باپ کو ترکی بہ ترکی جواب دینا، اچھی عادتیں نہیں، اچھا اخلاق نہیں۔ اس سے اصلاح نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ سے بہت دعا کرنی چاہیے کہ اللہ ہم تمام مسلمانوں کو مؤذّب بنا دے۔

## انا

تزکیے کے تعارف اور ادب کے بعد چند عنوانات سے گفتگو کا آغاز کریں گے۔ اس ضمن میں پہلا عنوان ”انا“ ہے۔

تزکیے کا عمل ایک مالی کے کام سے بہت ملتا جلتا ہے۔ مالی کیا کرتا ہے؟ کچھ پودے لگاتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ان پودوں کو غذا ملے اور یہ صحت مند ہوں، خوبصورت ہوں، پھلیں پھولیں۔ اس کے علاوہ جو بھی جھاڑ جھنکار (weeds) چاروں طرف اُگتی ہے ان غیر ضروری اور نقصان دہ جھاڑیوں کو مالی صاف کرتا رہتا ہے، اکھاڑتا رہتا ہے، تاکہ یہ جھاڑ جھنکار مٹی کی قوتِ نمو، سورج کی روشنی اور پانی و ہوا میں حصہ دار نہ بن جائے، لہذا وہ صفائی اور چھٹائی کرتا رہتا ہے (cultivation through pruning) تاکہ پودے اچھے اور صحت مند رہیں اور پروان چڑھیں، تزکیہ بھی دراصل یہی ہے۔ کسی چیز کو نشوونما دینا اور غلط چیزوں کو اُس کے پاس سے دُور کرتے رہنا۔ مومن کا کام بھی مالی کے کام جیسا ہی ہوتا ہے۔ مومن چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں مجھ میں رکھی ہیں اور جو وقت مجھے عطا کیا ہے وہ وقت اور صلاحیتیں نیکیوں کو پروان چڑھانے میں کام آئیں اور یہ وقت اور صلاحیتیں گناہوں کے کاموں میں استعمال نہ ہوں، گناہ اس کے وقت اور صلاحیتوں میں حصہ دار نہ بنیں۔ کسی بزرگ نے بہت ہی بیماری بات کہی ہے: ہر انسان اللہ کا لگایا ہوا ایک چھوٹا سا باغ ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ اس باغ کے اندر نیکیوں کے رنگ برنگے پھول کھلیں، نیکیوں کی بہار آئے، انسان نیک اعمال کی خوشبو سے معطر ہو اور گناہوں کی خزاں سے، گندے کاموں کی نجاست سے دور رہے اور برے کاموں کی بُو سے پاک صاف رہے۔ اپنے آپ کو برائیوں سے پاک کرنا اور نیکیوں سے آراستہ کرنا دو طرفہ عمل ہے اور اسی کا نام تزکیہ ہے۔ اپنی ذات کا تزکیہ کرنا ہے تو اس کے لیے خود شناسی (self recognition) یعنی اپنی پہچان بہت ضروری ہے۔

اناعربی زبان کا لفظ ہے، اس کا مطلب ہے، ”میں“۔ اس کائنات میں موجود تمام مخلوقات کے اندر ”میں“ کا احساس نہیں سوائے انسانوں اور جنات کے، لیکن ہم اپنی گفتگو کا دائرہ صرف انسان تک محدود رکھیں گے۔ انسانوں میں خود شعوری (self conscious) کا احساس موجود ہے۔ باقی جتنی مخلوقات ہیں وہ شعور (conscious) تو رکھتے ہیں، انکے اندر حس بھی ہے مگر خود



شعوری نہیں ہے۔ خود شعوری صرف اور صرف انسانوں یا جنوں میں ہے۔ اللہ نے انسان میں انارکھی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان خود کو پہچانے، اللہ کی مخلوقات میں اپنا مقام پہچانے، وہ یہ مشاہدہ کرے کہ اس پوری کائنات میں میرا کیا مقام و مرتبہ ہے؟ (where do I stand?) اس عالم شہادت کی تمام مخلوقات میں ”میں“ کہاں کھڑا ہوں؟ اپنے مقام اور مرتبے کو پہچانے گا، تب ہی ان سے درست اور متوازن تعلق قائم کر سکے گا، اور وہ یہ جان سکے گا کہ کس کا مجھ پر کتنا حق ہے اور میرا دوسروں پر کیا حق ہے، اور اسی طرح اپنی ذمہ داری (responsibility) کا بھی احساس ہوگا۔

اللہ کی کتاب میں بہت سی مخلوقات کا ذکر ہے۔ مثلاً پودوں اور پیڑوں کا، پہاڑوں کا، زمین و آسمان کا، سمندری مخلوقات کا، حشرات الارض کا، فرشتوں اور جنات وغیرہ کا۔ غور کریں تو انسان کسی نہ کسی اعتبار سے ان سب کے ساتھ متعلق ہے۔ اسی طرح عناصر فطرت اور عاقل مخلوقات یعنی فرشتوں اور جنوں کے ساتھ بھی اس کا تعلق رہتا ہے۔ لیکن انسان کے سوا کسی مرئی مخلوق میں ”انا“ نہیں ہے، اپنے کچھ ہونے کا احساس نہیں ہے۔ وہ اپنے بارے میں نہیں سوچتے کہ میں کون ہوں اور کیسا لگ رہا ہوں؟ جب کہ انسان یہ سب کچھ سوچتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے بارے میں حساس (sensitive) ہے، اُسے اپنی ذات کا شعور ہے۔ اسی طرح اپنی ہستی کا، اپنے ”میں“ ہونے کا احساس ہے۔ انسان کو اپنے ایک شخص (person) ہونے کا احساس ہے۔ وہ خود کو جانچ (judge) سکتا ہے۔ وہ اپنا محاسبہ کر سکتا ہے کہ میں یہ کام کرتے ہوئے اچھا لگ رہا ہوں یا نہیں۔ میں فلاں سوٹ پہن کے اچھا دکھ رہا ہوں یا نہیں۔ خود شعوری کی ایک جھلک آئینہ دیکھنے سے نظر آتی ہے، مخلوقات میں صرف انسان ہی شیشہ دیکھنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اُسے کہیں شیشہ نظر آجائے تو فوراً خود کو دوسرے پاؤں تک دیکھ ڈالتا ہے۔ جب کہ کوئی جانور یا کوئی دیگر مخلوق آئینہ دیکھ کر خود کو درست کرنے کی فکر نہیں کرتی۔ یہ تو صرف انسان کا خاصہ ہے کہ وہ سوچتا ہے کہ وہ کیسا لگ رہا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ اچھا لگے اور یہ اسی ”انا“ کا نتیجہ ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ان ضروری چیز ہے اس کو فنا نہیں کرنا۔ اسلام ہماری انامثال نے نہیں آیا بلکہ انا کو اس کے صحیح مقام پر رکھنے آیا ہے۔ اور شریعت اس معاملے میں ہماری مددگار ثابت ہوتی ہے۔ انا کو کچل دینا، ختم کر دینا مقصد نہیں ہے۔ نہ انا کو بالکل مٹانا ہے اور نہ حد سے بڑھانا ہے بلکہ مناسب اور معتدل رکھنا ہے۔ اس خود شعوری کی بنا پر انسان اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے کیا چیز فائدہ دے گی اور کیا نقصان، کیا

کروں اور کیا نہ کروں۔ اور اس قوت فیصلہ کی بنا پر ہی اللہ کے ہاں اس کا محاسبہ ہوگا۔

{ قَمِنَ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ } (الکھف: ۲۹)

”جو چاہے ایمان لے آئے جو چاہے کفر کرے۔“

ایمان لانے پر جزا ہے جب کہ ایمان نہ لانے پر سزا ہے۔ اس لیے کہ ایمان لانا یا نہ لانا اس کے فیصلے پر منحصر ہے، اس کی اپنی پسند (choice) ہے۔ جانوروں کے لیے کوئی جزا و سزا نہیں ہے اس لیے کہ جانور تو صرف جبلت پر عمل کرتے ہیں۔ وہ شعور کے ساتھ فیصلے نہیں کرتے، وہ تو بس سُدھائے ہوئے (programmed) ہوتے ہیں۔

انسانی امتحان کے لیے شعور ذات و اختیار:

انسان چونکہ شعور سے فیصلے کرتا ہے اور یہی شعور و اختیار اس کے امتحان کی وجہ ہے۔ دنیا میں انسان کا امتحان ہو رہا ہے۔ سورۃ الملک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيْكُمُ اَحْسَنُ عَمَلًا } (الملک: ۲)

”اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے جس نے زندگی اور موت کو پیدا کیا تاکہ وہ تم کو آزمائے کہ کون تم میں سے اچھے عمل کرتا ہے۔“

دنیا میں انسان امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، سو اس میں انا کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اس میں فیصلے کی قوت، ارادے کی طاقت، اچھے برے کی پہچان اور پسند و ناپسند کے معیارات ہوں، ورنہ امتحان نہیں ہو پاتا اور انسان بھی ہواؤں، پہاڑوں اور دریاؤں کی طرح کی مخلوق بن کر رہ جاتا، جانوروں کی طرح ایک بے اختیار مخلوق بن کر رہ جاتا۔ اسی لیے انسانوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کو اپنے ”میں“ ہونے کا احساس نہیں، جس کو اپنے شخص (person) ہونے کا احساس نہیں، جس میں انا نہیں۔ کیوں کہ اگر انا نہیں تو اللہ کے ہاں اس کا محاسبہ (accountability) بھی نہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص پاگل ہو جائے تو اس کی کوئی شخصیت (personality) نہیں رہتی۔ پاگلوں میں انا نہیں ہوتی، ان میں اپنی ذات کے بارے میں کوئی شعور نہیں ہوتا۔ لہذا اللہ کے ہاں پاگلوں کا کوئی محاسبہ، کوئی حساب کتاب، کوئی پوچھ گچھ نہیں ہے۔

اللہ کی ”انا“ اور انسان کی ”انا“:

جہاں تک اس لفظ ”انا“ کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ اپنے لیے بھی استعمال فرمایا ہے۔



سورہ طہ آیت نمبر ۱۳ میں فرمایا:

{ اِنِّى اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدْنِى وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِيذِكُرْنِى }

”بیشک میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز پڑھا کرو۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو دفعہ یہ لفظ اپنے لیے استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ میں نہ صرف ”انا“ ہے بلکہ ”انائے کبیر“ (infinite Ego) ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کو (The big I am) کہا ہے۔ اس کے برعکس انسان کی انا ”انائے صغیر“ (finite ego) ہے۔ نماز میں انسان اپنی انائے صغیر کو اللہ کی انائے کبیر کے آگے جھکا تا ہے تو انسان کی انا درست حالت پر قائم ہو جاتی ہے، پہلے وہ کہتا ہے اللہ اکبر، اللہ سب سے بڑا ہے، پھر سبحان ربی العظیم، ”میرا رب پاک ہے جو سب سے عظیم ہے۔“ سبحان ربی الاعلیٰ، ”میرا رب پاک ہے جو سب سے اعلیٰ ہے۔“ چنانچہ نماز میں اس بات کا اقرار موجود ہے کہ میں اکبر نہیں تو اکبر ہے، میں عظیم نہیں تو عظیم ہے، میں اعلیٰ نہیں اے اللہ! تو اعلیٰ ہے۔ نماز کے ذریعے انا اللہ سے جڑی (connected) رہتی ہے اور یہ ایک صحت مند ”انا“ کی نشانی ہے، جو اللہ کے آگے جھکی رہے اور اسی سے جڑی رہے۔

{ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ۚ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ } { (الاعلیٰ: 14-15)

”فلاح پائی اس نے جس نے اپنا تزکیہ کیا اور اس نے اللہ کا ذکر کیا اور نماز پڑھی۔“

انسان کے لیے اپنے مقام و مرتبے کی پہچان:

تزکیہ اسی کا ہو سکتا ہے جو نماز پڑھے اور اپنے رب کو یاد رکھے۔ جب اللہ سے تعلق درست ہوتا ہے تو انسان باقی مخلوقات میں اپنا مقام و مرتبہ پہچان لیتا ہے۔ ورنہ انسان کو کون بتائے گا کہ باقی مخلوقات میں تمہارا کیا مقام ہے؟ تم باقی مخلوق کی طرح زرعے حیوان ہو یا تم جانوروں سے بھی کوئی نچلے درجے کی ہستی ہو یا تم ان سب سے اعلیٰ اور افضل ہو۔ یہ تو وہی بتائے گا جس نے انسان کو پیدا کیا۔ قرآن میں آتا ہے: { اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ } { (الملک: ۱۳) ”کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے؟“ تو انسان ہونے کے ناطے میرا کیا مقام ہے؟ یہ اللہ کے سوا مجھے کوئی اور نہیں بتا سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں انسان کا مقام واضح فرمادیا۔ سورۃ البقرہ آیت نمبر ۳ میں فرمایا: { اِنِّى جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِیْفَةً } ”بیشک میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“ معلوم یہ ہوا کہ دنیا

کی ساری مخلوقات پر انسان اللہ کی طرف سے حکمران بنا کر بھیجا گیا ہے۔ انسان کو تمام مخلوقات پر فوقیت دی گئی ہے، بہت اعلیٰ مقام دیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی خلافت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ مخلوقات کی دیکھ بھال کی جائے، ان کی بہتری (wellbeing) کا خیال رکھا جائے جس کے بدلے میں تمام مخلوقات انسان کی خدمت (serve) کریں گی، اور انسان اُن سے کام لے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{وَسَخَّرَ لَكُمْ مِمَّا فِى الْأَرْضِ جِئِينَآ} (الجنائہ: ۱۳)

”اللہ نے مسخر کر دیا ہے تمہارے لیے جو کچھ کہ زمین میں ہے سب کا سب۔“

یعنی یہ سب انسان کے خادم ہیں، اس کی چاکری میں لگے ہیں۔ چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، پیڑ، پودے، جانور، دریا اور سمندر یہ سب انسان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، انسان ان پر حاکم ہے، یہ سب مسخر ہیں۔ وہ اللہ کے حکم سے ان سب پر حاوی ہے۔ اللہ کا نمائندہ بن کر آیا ہے۔ ان سب باتوں سے انسان کے اندر شرف کی اور عزت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جب اس کو یہ پتہ چلتا ہے کہ میں ان تمام مخلوقات سے اعلیٰ و اشرف ہوں تو وہ کبھی بھی ان کے آگے نہیں جھکتا، ان کے آگے ماتھا نہیں رگڑتا اور نہ اپنی انا کو کمتر مخلوق کے آگے ہی جھکاتا ہے۔ یہ تو ہوا عالم شہادت کی مخلوق کا حال۔ اب عالم غیب میں جو مخلوق ہے یعنی فرشتے، انکے ساتھ انسان کا رشتہ کیا ہونا چاہیے؟ ان کا کیا رتبہ اور کیا مقام ہے؟ کیا انسان فرشتوں سے اعلیٰ ہے یا فرشتوں جیسا ہے یا ان سے کمتر ہے؟ اس کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ ہی نے ہمیں بتایا ہے۔ سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۳۳ میں فرمایا:

{وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ} (البقرہ: ۳۳)

”اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ سجدہ کرو آدم کو، تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔“

قرآن میں بعض مقامات پر آتا ہے: {فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ} (الحجر: ۳۰)

”سب کے سب فرشتوں نے اکٹھے سجدہ کیا۔“ انسان کے آگے سب جھک گئے تو پتہ چلا کہ وہ تو مسجود ملائک ہے، اُسے تو فرشتوں نے سجدہ کیا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات (master piece) ہے سب مخلوقات میں اشرف، اعلیٰ، افضل، ارفع اور بہترین ہے۔ نوری مخلوق سے بھی بہتر، ناری مخلوق سے بھی بہتر اور تمام خاکی مخلوق سے بھی بہتر ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے، آپ کو، ہم انسانوں کو کتنے پیار سے بنایا ہے۔ ہر انسان اللہ



کی خَلَاقِ کا نمونہ ہے۔ بھڑبکریوں کی طرح نہیں کہ سب انسان ایک جیسے ہو گئے، ایک ہی سانچے (mould) بنا کر سب کو اس میں ڈھال دیا۔ ہر انسان دوسرے انسان سے جدا ہے۔ جڑواں بچے (twins) بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ان کی بھی اپنی ایک الگ شناخت، الگ پہچان، الگ انا، الگ شخصیت ہوتی ہے۔ ہر انسان کی انگلیوں کے پور تک مختلف ہیں۔ ہر انسان نایاب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خاص مقام عطا فرمایا ہے۔ انسان اپنے رب کے نزدیک بہت منفرد (special) ہے جب انسان خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھتا ہے تو اس کے اندر اعتماد پیدا ہوتا ہے، خوشی کا احساس ہوتا ہے، اپنی اہمیت کا احساس اُجاگر ہوتا ہے، شکر کے جذبات اُٹاتے ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۷۰ میں فرمایا:

{وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَهُمْ فِي الْوَجْدِ وَالْبَحْرِ وَرَمَقْنَهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ  
وَوَضَعْنَاهُمْ عَلَىٰ كَيْسٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْصِيلًا}

”ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں، اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور بہت سی مخلوقات پر انہیں فوقیت بخشی۔“

انسان جب اس طرح سوچتا ہے کہ میں اتنا اعلیٰ ہوں، اتنا رفیع ہوں تو وہ اپنے رب سے جڑا رہتا ہے، اپنے صحیح مقام کو پہچان لیتا ہے، اس کی انصاحت مندر رہتی ہے اور وہ پُر اعتماد رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی صورتوں کے بارے میں فرماتا ہے:

{وَصَوَّرَكُمُ فَاَحْسَنَ صُوْرَكُمْ} (التغابن: ۳)

”ہم نے تمہاری صورتیں بنا کیں اور کیا ہی اچھی بنائی ہیں تمہاری صورتیں۔“

جس رب نے مجھے بنایا ہے اس کی نظر میں میں بہت خوبصورت ہوں، میں بہت اچھا ہوں، یہ احساس انسان کے اندر خوشی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھے، بنانے والے کی نظر سے جانچے۔ پیدا بھی اُسی نے کیا ہے، لوٹ کر بھی اُسی کی پاس جانا ہے، وہی مالک ہے، وہی خالق ہے، وہی رازق ہے۔ جس کی میں ملکیت ہوں، جس نے مجھے بنایا ہے، جب اس کی نظر میں میں اتنا اچھا ہوں یا اتنی اچھی ہوں تو مجھے کسی اور کی کیا فکر؟ اردو میں ایک کہاوت ہے کہ ”دلہن وہی جو پیمان بھائے“ سہاگن وہی ہے جو شوہر کو اچھی لگے وہ عورت کسی اور کو اچھی نہیں لگتی تو نہ لگے۔ اگر میاں کو اچھی لگتی ہے تو بس کافی ہے۔ کچھ خواتین کے اوپر کوئی خاص رنگ یا ڈیزائن بالکل نہیں چٹتا، لوگ کہتے ہیں تم پر یہ رنگ (suit) نہیں رہا، تم پر یہ چیز اچھی نہیں

لگتی، لیکن وہ پھر بھی پہنتی ہیں کہ میرے میاں کو یہ رنگ مجھ پر اچھا لگتا ہے۔ تو جب انسان خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھتا ہے پھر وہ لوگوں کی رائے (opinion) سے، اُن کی پسند اور ناپسند سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس کو کسی کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ اس بات پر مطمئن رہتا ہے کہ میں اللہ کو تو اچھا لگتا ہوں۔ مجھے تو وہی کام کرنے ہیں جو میرے رب کو پسند ہیں۔ تو جب تک انسان اللہ سے جڑا رہتا ہے اپنی نظروں میں خود بہت اعلیٰ وارفع رہتا ہے اور جب انسان اللہ سے اپنا تعلق کاٹ لیتا ہے تو وہ خود ہی اپنے آپ کو کمتر مخلوقات کا غلام بنا لیتا ہے۔ اُن کی آراء، ان کی پسند ناپسند سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ پھر اپنا مقام سے گر جاتی ہے، احساس کمتری پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اب خود کو اللہ کی نظر سے نہیں دیکھ رہے۔ خدا شعوری (God conscious) کے بجائے لوگوں کی پروا (people conscious) کرنے لگے ہیں، اور لوگوں کی بہت پروا کرنا، اپنے آپ کو لوگوں کی نظر سے دیکھنا کہ لوگ کیا کہیں گے، کیا سوچ رہے ہوں گے انسان کو پریشان (nervous) کر دیتا ہے۔ اعتماد ختم ہونے لگتا ہے، احساس کمتری پیدا ہونے لگتا ہے۔ اور یہ تمام چیزیں انا کو اس کے مقام سے گرا دیتی ہیں اور جب تک انسان خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھتا ہے متقی رہتا ہے، انا: معتدل رہتی ہے، یہ احساس رہتا ہے کہ میں مخلوقات میں سب سے برتر اور اعلیٰ ہوں۔ ان کی دیکھ بھال میری ذمہ داری ہے، تو ان باتوں سے، ان احساسات سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے، انسان اپنی نظروں میں باعزت رہتا ہے۔ اور یہی خود اعتمادی اور اپنی نظروں میں باعزت ہونا مومن میں مطلوب اور پسندیدہ صفت ہے۔

### عزت و بقائے نفس:

بندہ مومن کو چاہیے کہ اپنے آپ کو پسند کرے، خود کو برا بھلا نہ کہے۔ بعض مذاہب میں 'انا' سے نمٹنے کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ انا کو کچل کر رکھ دو اور جب انھوں نے اس طرح اپنی انا کو کچلنے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ برعکس نکلا۔ جب انا کو دبایا تو پھر ساری کی ساری توجہ انا پر مرکوز ہو کر رہ گئی، انا کے گرد ہی پوری زندگی ضائع ہو گئی۔ اس انا کو ذلیل کیا، اپنے آپ کو جھکا یا، اپنے آپ کو تنگ کیا۔ اس انا کو کچلنے کے لیے ظلم کیا تو ساری کوششیں اکارت گئیں کیوں کہ یہ غیر فطری رویہ ہے۔ اللہ نے فطرت میں انا رکھ دی ہے یہ کچلی نہیں جاسکتی۔ اگر اس کو دبائیں گے تو دس مزید خرابیاں جنم لیں گی۔ خود شکستگی (self defeating) مقصد بن جائے گی اور انا پر توجہ دو چند ہو جائے گی۔ کچھ





لوگوں کی ساری زندگی اسی مہم میں گزر جاتی ہے، اپنے نفس کے ساتھ ہی کھم گھارہتے ہیں مگر کوئی مثبت (positive) نتیجہ برآمد نہیں ہوتا، بلکہ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ نفس اُن کو بچھاڑ دیتا ہے۔ اگر اللہ کا منشا یہ ہوتا کہ انسان اپنی ذات سے نفرت کرے یا انسان اپنے آپ کو گھٹیا، بے کار، بے عزت اور کمتر سمجھے تو اللہ تعالیٰ استغفار کا دروازہ کھلا نہ رکھتا۔ بلکہ یہ حکم ہوتا کہ گناہ ہو گیا ہے تو ساری زندگی احساسِ جرم (guilt) میں مبتلا ہو۔ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ ہم احساسِ جرم میں مبتلا رہیں۔ اگر ہم ہر وقت احساسِ شرمندگی، احساسِ ندامت میں رہیں گے، اور یہ بوجھ (extra baggage) ساری زندگی اٹھا کے رکھیں گے تو ہم نیکیوں کی دوڑ میں کبھی آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ہم اس احساسِ جرم (guilt) کو چھوڑ دیں، معافی مانگ کر گناہوں کو بھول جائیں۔ اللہ معاف کر دیتا ہے، گناہ مٹا دیتا ہے، اُس نے معافی کا دروازہ کھلا رکھا ہے، تاکہ یہ نجاست پیچھے چھوڑ کر ہم اپنی راہ لیں۔ چنانچہ دوسروں کے سامنے اپنے گناہوں کا تذکرہ کرنے سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔ اسلام میں بلاوجہ اعترافِ گناہ (confession) نام کی کوئی چیز نہیں ہے کیوں کہ اس سے انسان کی عزتِ نفس پر زد پڑتی ہے۔ کوئی شخص جان بوجھ کر اپنے آپ کو بدنام کرنے کی کوشش نہ کرے، اپنے گناہوں کی تشہیر نہ کرے، خود کو دوسروں کی نظروں میں گرانے کی کوشش نہ کرے، بلاوجہ اپنی بے عزتی نہ کروائے۔ خود کو ناپسند کرنا، اپنی ذات سے کراہیت و گھن محسوس کرنا، اپنے آپ سے نفرت (self loathing) میں مبتلا رہنا انسان میں بے اعتمادی پیدا کر دیتا ہے، انسان کی شخصیت مسخ (distort) ہو جاتی ہے۔

جب انسان خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھتا ہے کہ اللہ نے مجھے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے، احادیث مبارکہ کے مطابق اللہ بندے سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے تو انسان کو اپنے اوپر بڑا ہی ناز ہوتا ہے، خود کو اہم سمجھتا ہے۔ فطری طور پر انسان چاہتا ہے کہ اللہ مجھ کو پسند کرے۔ یہ چیز اس کے اندر ودیعت شدہ (ingrained) ہے کہ اللہ مجھ سے راضی ہو، مجھے پسند کرے اور یہ بھی انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ بھی مجھے پسند کریں۔ یہ کوئی نہیں چاہتا کہ میں معاشرے میں بُرا سمجھا جاؤں، بے عزت ہوں، رسوا اور ذلیل ہوں، لوگ مجھ پر ہنسیں اور مذاق اڑائیں۔ لیکن جب انسان وحی سے کٹ جاتا ہے تو اس طرح کی عجیب عجیب بیماریوں کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔

یہ جو فطرت میں خواہش ہے کہ اللہ مجھے پسند کرے اور لوگ بھی مجھے پسند کریں، اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان گناہوں سے بچے اور لوگوں کے سامنے اچھے حلے میں رہے۔ اپنی خلق کو بھی اچھا رکھے اور اپنی خلق کو بھی اچھا رکھے۔ رسول اکرم ﷺ نے ہمیں اپنا ظاہری حال حلّیہ بگاڑنے سے منع فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر کسی نے ایک جو تاپہنا ہے اور دوسرا نہیں پہنا، آدھے سر پر بال ہیں اور آدھے سر پر نہیں، پچھے حالوں گھومنا یا بیاروں کی طرح چلنا ان تمام امور سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ نبی اکرم ﷺ صاف سترے کپڑے پہنا کرتے تھے اور بالوں میں کنگھی کر کے رکھتے تھے۔ اسی لیے اسلام میں پاکیزگی اور صفائی پر اتنا زور ہے ((الطَّهُوْرُ شَطْرُ الْإِيْمَانِ))<sup>(۱)</sup> ”پاکیزگی ایمان کا حصہ ہے۔“

جن مذاہب میں انا کو کچلنے پر زور دیا گیا ہے، ان کے اندر گندارہنے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ ان کے ہاں معیار یہ ہے کہ جو جتنا گندارہے، بال لمبے، الجھے ہوئے، ناخن بڑے اور غلیظ، دانت کالے اور سانس بدبودار اور لباس بھی میلا اور بدبودار رہتا ہے اتنا ہی وہ مٹی سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگوں کی نظروں میں جتنا حقیر اور ذلیل ہو، اللہ کی نظر میں اتنا ہی بلند اور اعلیٰ ہے یہ بالکل غلط سوچ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اس کے بال بکھرے ہوئے اور پراگندہ تھے تو نبی اکرم ﷺ نے اسے دیکھ کر فرمایا: ”کیا اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جس سے وہ اپنے بالوں کو ٹھیک کرے۔“ اسلام چاہتا ہے کہ ہم لوگوں کے سامنے اچھے (presentable) لگیں، صاف سترے رہیں۔ خود کو عیب دار نہ بنائیں اور نہ اپنے عیب اور گناہ لوگوں پر کھولیں۔ اسی طرح ایک مومن یہ تمنا نہ کرے کہ لوگ میری بے عزتی کریں، اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ کوئی میرا مذاق اڑائے۔ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے:

{وَجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ} (الشعراء: ۸۳)

”اے اللہ بعد میں آنے والوں میں میرا ذکر خیر باقی رکھ۔“

انسان کی یہ فطری خواہش ہے کہ لوگ اُسے اچھے نام سے یاد کریں۔ نبی اکرم ﷺ کی دعا کا بھی حصہ ہے:

((وَجْعَلْنِي فِي غَنِيِّ صَغِيرٍ اَوْ فِي اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا))<sup>(۲)</sup>

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب التعوذ من شر ما عمل۔۔۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب التعوذ من شر ما عمل۔۔۔



”اے اللہ! مجھے اپنی نظر میں چھوٹا دکھا اور لوگوں کی نظروں میں بڑا کر کے دکھا دے۔“

جب انصاحت مند ہوگی تو انسان کا رویہ اپنے خالق اور مخلوق کے ساتھ بالکل درست رہے گا۔ انا اللہ کے آگے جھکی رہے اور اس سے جڑی رہے، تو انسان اللہ کی نظر میں بلند رہتا ہے۔ اسے پورا شعور ہوتا ہے کہ میں اس وقت تک باعزت ہوں جب تک اللہ کی نظر میں باعزت ہوں، میرے لیے اللہ کا بندہ ہونا باعثِ عزت ہے۔ عبد اللہ سے بڑھ کر کوئی مرتبہ (badge of honour) نہیں ہو سکتا۔ ایسے شخص کو بس ایک ڈر یا خوف ہوتا ہے کہ کہیں میں اللہ کی نظر سے نہ گر جاؤں۔ یہ احساس تقویٰ کو جنم دیتا ہے، اسی لیے قرآن مجید نے تقویٰ پر بہت زور دیا ہے۔

تقویٰ اور اس کا اثر:

انا کا درست مقام پر ہونا اور اللہ کے ساتھ جڑا ہوا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اگر کوئی ایسا موقع آجائے کہ اللہ اور انسان دونوں کی نظر میں بیک وقت باعزت رہنا ممکن نہ رہے تو متقی شخص لوگوں کی نظر میں گرنا قبول کر لیتا ہے لیکن اللہ کی نظر میں گرنا اور بے عزت ہونا قبول نہیں کرتا۔ کیوں کہ اگر وہ اللہ کی نظر میں گر جائے گا، تو وہ اپنی انسانی فضیلت (human dignity) کھو بیٹھے گا۔ اپنے تشخص، عزت نفس (self respect) سے ہاتھ دھو بیٹھے گا، وہ اپنی ہی نظروں میں گر جائے گا۔ اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت نے جب اللہ کی نظر میں بلند مقام حاصل کرنے کی فکر چھوڑ دی، تو وہ اللہ کی نظر سے گر گئی، نتیجتاً وہ اپنی بھی عزت گنوا بیٹھی۔ لہذا آج کے انسان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہر عیب، ہر برائی کو آگے بڑھ کر اپنالیتا ہے بلکہ دلیل بھی دیتا ہے کہ انسان تو ہے ہی گندہ، گناہوں کی پوٹ اور انسان کے جینیات (genes) کے اندر ہی گندگی ہے، انسان خود اپنے ہی آپ کو برا سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن متقی اللہ کی نظروں سے نہیں گرنا چاہتا۔ اور یہ واقعی بڑا بھاری اور مشکل قدم ہوتا ہے کہ انسان اللہ کی خاطر لوگوں کی نظروں میں گرنا قبول کر لے۔ یہ بہت بڑا فیصلہ ہے، اور اس کے لیے اپنی شخصیت میں ایک چیز درکار ہے اور وہ ہے اپنے اوپر حد درجے کا اعتماد۔ اپنے شرف کا، اپنے مقام کا احساس، پُر اعتماد لوگ ہی یہ فیصلہ (choice) کر سکتے ہیں۔ جن میں ذرا بھی اعتماد کی کمی ہو وہ یہ راہ کبھی بھی اختیار نہیں کر سکتے کہ خواہ لوگوں کی نظر میں گر جائیں لیکن اللہ کی نظروں میں اپنا مقام برقرار رکھیں۔ یہ اعتماد تقویٰ سے آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبودیت میں حریت ہے، جب ”انا“ اللہ کی غلام بن جائے تو انسان لوگوں کے معیار اور انکی آراء اور تنقید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور اگر انانے

صغیر انائے کبیر کے آگے نہ جھکے تو مختلف اخلاقی اور روحانی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ اور جب اپنا مقام یاد نہیں رہتا تو پھر اپنا مقصد بھی یاد نہیں رہتا کہ ہم دنیا میں کیوں آئے ہیں؟ اللہ نے فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات: ۵۶) ”میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔“ لیکن جب انسان کو اپنا مقام اور مقصد حیات یاد نہیں رہتا تو انسان جانوروں کی غلامی شروع کر دیتا ہے یا پھر مظاہر قدرت کو سجدے کرنے لگتا ہے، اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے، اللہ کی رضا حاصل کرنے کے بجائے ان سے دنیا کا خریدار بن جاتا ہے، اس کا رویہ غیر متوازن (disbalanced) ہو جاتا ہے اور پھر اس کے خالق سے بھی اور مخلوق سے بھی تعلقات بگڑ جاتے ہیں۔

### انا میں اعتدال:

جس طرح انا کو حد سے گرا نا پسندیدہ نہیں، اسی طرح انا کو حد سے بڑھانا بھی انتہائی خطرناک ہے۔ مومن کی انا چونکہ اپنے صحیح مقام پر اور حد کے اندر ہی رہنی چاہیے چنانچہ وہ اپنی انا (ego) کو درست مقام پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے، لہذا مومن با ادب ہوتا ہے، اس کا رویہ (attitude) درست ہوتا ہے، اس کے اخلاق (etiquette) صحیح ہوتے ہیں لیکن اگر انا حد سے بڑھ جائے تو بے ادبی لازماً پیدا ہوتی ہے۔ شیطان نے اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی بے ادبی کا مظاہرہ کیا اور اس بے ادبی کی وجہ اس کی اناتھی، اسی انا نے ابلیس کو رجیم بنایا، اسی انا نے ”عزازیل“ کو ”ابلیس مردود“ بنا دیا۔ جب رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو پہلا لفظ اس کی زبان پر ”انا“ آیا ﴿إِنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نَّارِ السَّمُومِ﴾ (الاعراف: ۱۲) ”میں اس سے بہتر ہوں۔“ انسان جس کو بڑا سمجھتا ہے، مشکل اور پریشانی میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام پر جب مشکل پڑی تو ان کی زبان پر اللہ کا نام آیا لیکن شیطان کی زبان پر لفظ ”انا“ آیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی نظر میں اللہ سب سے بڑا تھا۔ ان کی انا اللہ کے آگے جھک چکی تھی لیکن شیطان کی انا نہیں جھکی۔ اس نے حکم عدولی کی، نافرمانی کی، بدتمیزی اور بے ادبی کا مظاہرہ کیا اور کہا ﴿إِنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نَّارِ السَّمُومِ﴾ (الاعراف: ۱۲) ”میں اس سے بہتر ہوں۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کا بادشاہ جس کا نام نمرود تھا، اس کے سامنے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کا ذکر کیا تو اس نے بھی کہا ﴿قَالَ أَنَا أُحْمِي وَأَمِيتُ﴾ (البقرة: ۲۵۸) ”میں زندگی دیتا ہوں، اور میں موت دیتا ہوں“، میں ہی سب کچھ ہوں۔ جب انسان میں انا زیادہ ہو جاتی





ہے تو وہ تکبر والا رویہ اختیار کرتا ہے۔ فرعون نے تو سارے ریکارڈ توڑ دیے، تکبر کی تمام حدود پار کر گیا۔ اس نے دعویٰ کیا {فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى} (النزعت: ۲۴) ”میں ہوں تمہارا سب سے اعلیٰ رب“۔ اس تکبر نے اس کو برباد کیا، اسی نے اس کو ڈبویا، نشانِ عبرت بنا دیا۔ تو انا کو قابو (control) کرنا نہایت ضروری ہے، حد سے زیادہ نہ بڑھنے پائے، حد سے بڑھے گی تو تکبر پیدا ہوگا اور انسان کبھی جنت حاصل نہیں کر سکے گا۔ دوسری طرف حد سے زیادہ گھٹ جائے گی تو دنیا میں ناکارہ اور بیکار ہو جائے گا، خالق و مخلوق کے ساتھ انسان کا کیا رویہ ہونا چاہیے، وہ انا ہی متعین (determine) کرے گی۔ اگر انا اپنے مقام پر ہے تو مومن یا ادب ہوگا۔ خالق کو خالق کا حق اور مقام دے گا۔ اور مخلوق کو مخلوق کا حق اور مقام دے گا اور اگر انا اپنے مقام سے بڑھ گئی ہے تو پھر وہ بے ادب ہو جائے گا، نہ اللہ کی تعظیم کرے گا، نہ مخلوق کی عزت کرے گا۔ اور اگر یہی انا اپنے مقام سے گھٹ گئی تو پھر اس کی اپنی نظروں میں بھی عزت نہ رہے گی۔

# اسراف

لفظ اسراف کا مفہوم:

اسراف کا لفظ قرآن میں استعمال ہوا ہے، اسی سے ملتا جلتا ایک اور لفظ بھی قرآن میں آیا ہے یعنی ”تکبر“ (exaggeration) اسی طرح ایک اور لفظ بھی قرآن میں استعمال ہوا ہے ”تذیر“ یعنی بہت زیادہ فضول خرچی کرنا (wasteful extravagance)۔ اسی طرح اسراف کے لیے مزید بھی کئی الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں۔ ہم اس گفتگو میں اسراف کا کوئی محدود مطلب نہیں لیں گے بلکہ جامع انداز میں بات کریں گے۔ یہ لفظ جب ہم سنتے ہیں تو خیال محض پیسے کی طرف جاتا ہے کہ صرف مالی معاملات ہی میں اسراف کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ زیادہ تر اسراف پیسے ہی میں ہوتا ہے لیکن دیگر نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی ہیں، مثلاً بول چال، کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے، اس میں بھی اسراف کیا جاتا ہے۔ لہذا اپنی طرز زندگی کو جانچئے کہ اس کے سوا ہم کہاں کہاں اسراف کا شکار ہو رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے:

{كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ} {الاعراف: ۳۱}

”کھاؤ پیو مگر اسراف مت کرو بے شک اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں سے محبت نہیں فرماتا۔“

انبیاء کرام ﷺ نے اپنی اپنی قوموں سے فرمایا تھا:

{بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ} {الاعراف: ۸۱}

”بلکہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو۔“

دراصل ہماری زندگی میں کئی جگہ پر اسراف ہو رہا ہوتا ہے لیکن ہمیں اس کا شعور نہیں ہوتا، اس کا سرسری سا اندازہ کسی کی طرز زندگی (life style) کو دیکھ کر لگا یا جاسکتا ہے۔

سورۃ الفرقان میں نیک لوگوں کی صفت آئی ہے:

{وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا} {۶۷}

”نیک لوگ وہ ہوتے ہیں کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو وہ اسراف نہیں کرتے۔“

سورۃ المؤمن کی اٹھائیسویں آیت میں فرمایا:

{إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ}



”بے شک اللہ نہیں ہدایت دیتا اسراف کرنے والے کو، جھوٹے کو۔“

اس آیت میں دو الفاظ آئے ہیں مُسْرِف اور كَذَّاب یعنی اسراف کرنے والا اور بہت جھوٹ بولنے والا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باتوں میں بھی اسراف کیا جاسکتا ہے۔ جب انسان بہت زیادہ بولتا ہے تو جھوٹ بولنا آسان ہو جاتا ہے۔ سورہ مؤمن میں ایک اور آیت آتی ہے:

{كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ} (۳۴)

”اور اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے ہر اس شخص کو جو اسراف کرنے والا، شک میں پڑنے والا ہو۔“

سورہ دخان میں فرعون کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

{اِنَّهٗ كَانَ عَلٰی تٰیۡمٰنٍ الْمُسْرِفِیۡنَ} (۳۱)

”وہ بڑا سرکش اسراف کرنے والوں میں سے تھا۔“

ان تمام آیات پر غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ اسراف کے معنی فضول خرچی کرنے سے کہیں زیادہ وسیع ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ دو چار پیسے زیادہ خرچ کرنے والوں کو اتنا سخت عذاب نہیں دے گا۔ سوان صفحات میں ہم جاننے کی کوشش کریں گے کہ مالی معاملات کے علاوہ اسراف کہاں کہاں کیا جاتا ہے۔

**اسراف اور غلو کے لغوی معنی:**

پہلے ”اسراف“ اور ”غلو“ کا مطلب سمجھتے ہیں۔ ان دونوں الفاظ کا مطلب ہے کسی کام کا ضرورت اور فائدہ مند حد سے آگے بڑھ جانا۔ جس کی وجہ سے وہ کام بے کار یا لائق نقصان کا سبب بن جائے اس کو اسراف کہتے ہیں۔ اس کی ضد نخل ہے اور درمیانی نقطہ اعتدال ہے تو پتہ چلا کہ ضرورت کی حد تک کسی چیز کو استعمال کرنا اسراف نہیں ہے، بلکہ ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا یعنی چیز کو ضائع (waste) کرنا یا ایسے استعمال کرنا کہ اس سے دنیا یا آخرت میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، یہ اسراف ہے۔

**آواز کا اسراف:**

آواز کا اسراف یہ ہے کہ جہاں کم اور دھیمی آواز سے ضرورت پوری ہو سکتی ہے وہاں اونچی آواز استعمال کی جائے۔ مثلاً استاد کلاس میں طلبہ سے مناسب آواز میں بات کر رہا ہو جو کہ تمام طلبہ کو پہنچ رہی ہو، سب کی ضرورت کو پورا کر رہی ہو، تو اتنی آواز فائدہ مند ہے، کافی ہے، سب کو بات سمجھ میں آرہی ہے۔ لیکن وہی استاد اپنی کلاس میں چیخنا شروع کر دے، بلا وجہ اونچی اونچی آواز میں بولنا شروع کر دے تو اس سے ایک دم کلاس میں بے چینی شروع ہو جائے گی، سماعت پر ناگوار گزرے گی، سر میں درد شروع ہو جائے گا۔ جب ہم پر تیز آواز اتنی گراں گزرتی ہے تو بچوں پر جب ہم گلا پھاڑ کر

چیننے ہیں تو ان پر کیا اثر ہوتا ہوگا۔ اس رویے سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔ گفتگو اپنا اثر کھودیتی ہے، جو آپ کہنا چاہتے ہیں اس سے لوگوں کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ آواز کی کڑھکی اور بلندی سے دھیان ہٹ جاتا ہے، اس مضر آواز (noise pollution) سے آپ کا بھی گلا دکھا اور مقصد بھی حاصل نہ ہوا بلکہ اُلٹا نقصان ہوا!

ہم آواز کا بے جا اور بے انتہا اسراف کرتے ہیں، بچوں پر، نوکروں پر، فون پر بات کرتے ہوئے اور بچوں پر تو خاص طور پر اس کے بہت بڑے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ غصہ میں ہماری آواز خود بخود بلند ہو جاتی ہے، بجائے اس کے کہ گھر میں کسی سے اگر کوئی غلطی یا قصور ہو جائے تو اس کے پاس جا کر آہستگی اور تحمل سے بات کریں اور سمجھائیں۔ اس کا نتیجہ یقیناً بہت اچھا نکلے گا، پُر اثر (effective) بات ہوگی، اُس کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ جب انسان بلاوجہ چیخ و پکار کرتا ہے تو اپنا مقام کھو بیٹھتا ہے۔ لوگ اس کی بات کو اہمیت نہیں دیتے اور لوگوں کے اندر منفی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ زور سے بولنے سے بات پُر اثر نہیں ہوتی بلکہ بے اثر ہو جاتی ہے، اسراف کا یہی نقصان ہے۔

قرآن میں ہمیں آواز کے اسراف پر ہدایت ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ لقمان میں آواز کے بارے میں فرمایا:

{وَ اَغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْتَكَ الْاَصْوَاتُ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ} (۱۹)

”اور اپنی آواز ذرا پست رکھو بے شک سب سے بڑی آواز گدھے کی آواز ہوتی ہے۔“

گدھا اپنی آواز پر قابو نہیں رکھ سکتا، وہ جب بھی آواز نکالتا ہے چیخ و پکار کی صورت میں نکلتی ہے۔ گدھے کی تو مجبوری ہے وہ تو بولتا ہی اس طرح ہے اور اُس کا اس طرح بولنا قابل اعتراض نہیں ہے لیکن انسان جب اس طرح گلا پھاڑ کر چیخنے لگ جائے اور گدھے کی مشابہت اختیار کر لے تو یہ انتہائی خطرناک طرز عمل ہے۔

باتوں میں اسراف:

بولنا، بولنا اور بے توجہی سے بولنا چلے جانا باتوں میں اسراف ہے۔ اتنی باتیں کرنا کہ دوسرے کو اپنی بات کہنے کا موقع ہی نہ ملے، چھوٹی چھوٹی تفصیلات بتاتے چلے جانا، بات کو کھینچ جان کر طول دینا کہ انسان خود ہی بھول جائے کہ بات کہاں سے شروع کی تھی۔ یہ انداز گفتگو سر اسراف پر مشتمل ہے۔ انسان کو مناسب حد تک بات کرنی چاہئے، دوسروں کی بھی بات سنے، غیر ضروری تفصیلات سے گریز کرے، نہ دوسرا آپ کی باتوں سے بور ہو اور نہ آپ پر بوجھ پڑے۔ بہت لمبی بات کرنے وا



لوں سے لوگ گھبراتے ہیں، کتراتے، (avoid) کرتے ہیں۔ لہذا بات میں بخل نہ کریں اور نہ اسراف ہی کریں، نئی تلی بات سوچے سمجھے الفاظ میں کریں۔ بعض دفعہ لوگ گھسے پٹے جملے دہراتے رہتے ہیں، اتنا ہنستے ہیں کہ حد ہو جاتی ہے، یا کچھ الفاظ اُن کے تکیہ کلام بن جاتے ہیں، یا تاکیداً دہرائے چلے جاتے ہیں، یہ بھی اسراف ہے جس سے آپ کی طاقت ضائع ہوتی ہے۔ غیر ضروری تفصیلات بات کو بوجھل کر دیتی ہیں، لوگوں پر سننا ناگوار گزرتا ہے۔

### جسمانی حرکات میں اسراف:

جسمانی حرکات میں اسراف یہ ہے کہ مثلاً آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کچھ لوگ بیٹھے ہوئے مسلسل حرکت کرتے رہتے ہیں، مانگیں ہلاتے رہتے ہیں، ہاتھ چلاتے رہتے ہیں، بعض لوگ چل چل کر پڑھاتے ہیں، لیکچر دیتے وقت ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر چلتے پھرتے بات کرتے ہیں۔ یہ افعال بھی سننے والوں کو یکسو نہیں ہونے دیتے۔ انسان کی جسمانی حرکات (body language) پر اعتماد ہونی چاہئیں۔ اسی طرح بات کرتے ہوئے بار بار ناک کو چھونا انتہائی بُرا تاثر ڈالتی ہے۔ بعض لوگوں کی جسمانی حرکات یہ پیغام دے رہی ہوتی ہیں کہ یہ صاحب اوپر سے تو بڑے پرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر اندر سے خوف زدہ (anxious) ہیں، پریشانی کا شکار ہیں۔ اس پر قابو پانا ضروری ہے۔ خاص طور پر انٹرویو وغیرہ میں تو ہاتھوں کو باندھ کے آرام و سکون کے ساتھ بیٹھ جائیں اور غیر ضروری حرکات سے پرہیز کریں۔ بعض لوگ ہر وقت (chewing gum) چباتے رہتے ہیں یا پھر منہ میں الائچی یا سپاری رکھ کر منہ چلاتے رہتے ہیں، یہ بھی نامناسب ہے۔

ایک اور انداز یہ ہوتا ہے کہ فون پر کسی کو راستہ بتاتے ہوئے زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کا بھی استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ تھوڑے بہت تو ہاتھ فطری طور پر چلتے ہی ہیں، کبھی کبھار بات کرتے ہوئے کوئی بات (point) سمجھاتے ہوئے ہاتھوں سے مدد لینا ضروری ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ بھی اس طرح کیا کرتے تھے۔ لیکن دائیں بائیں گھومنا اور ایک طرح سے ناچتے رہنا ٹھیک نہیں ہے اس سے توجہ بٹتی (divert) ہوتی ہے۔ یہ بھی درست نہیں، یہ بھی اسراف کے اندر آتا ہے۔ اسراف سے معاشرے میں بد نظمی پیدا ہوتی ہے۔

ابھی تک ہم نے اسراف کے ضمن میں جو گفتگو کی یعنی آواز، بول چال، حرکات و سکنات کا اسراف یہ چیزیں خدا نخواستہ گناہ میں شامل نہیں ہوتیں فقط مکروہ ہیں۔ اللہ سے امید ہے کہ وہ ان چیزوں کی وجہ سے کسی کو ہلاک نہیں کرے گا۔ روحانی سکون اور اخلاق میں شانستگی کی خاطر یہ چیزیں ناگزیر ہیں تاکہ

ہماری شخصیت بدنامہ ہو۔ یہ سب اس لیے ہے کہ ہم اپنے آپ کو سنوار رہے ہیں، اپنا تزکیہ کر رہے ہیں۔ اپنے ظاہر کو اور باطن کو ساتھ ساتھ سنوارنا ہے، خود کو شائستہ بنانا ہے تاکہ ہم دوسروں کی نظر میں بھی بدنامہ نہ لگیں۔ یہ آواز کا اسراف اور جسم کا اسراف خود آپ کے لیے بھی نقصان دہ ہوتا ہے کیوں کہ ایسے لوگ دیکھنے میں اچھے نہیں لگتے، متاثر نہیں کرتے، یہ ایک خامی ہے اس کو سدھارنا چاہیے۔

### اعتراض میں اسراف:

ایک اور چیز قابل غور ہے اعتراض میں اسراف کیسے ہوتا ہے؟ اعتراض کرتے ہوئے مبالغہ آرائی (sweeping statement) کرنا، مثلاً ہزار دفعہ کہا ایسا مت کرو، سو دفعہ بات سمجھائی ہے پھر بھی سمجھ میں نہیں آ رہا، اس کو مبالغہ کہتے ہیں، البتہ یہ جھوٹ میں شمار نہیں ہوگا کیوں کہ یہ ایک محاورہ ہے، ایسے الفاظ محاورۃً استعمال ہوتے ہیں۔ مگر یہ گفتگو کی خامی ہے اس سے جھنجلاہٹ (irritation) شروع ہو جاتی ہے، اس قسم کا رویہ سامنے والے پر منفی اثر ڈالتا ہے، ڈھٹائی آنے لگتی ہے۔ جب ہم مبالغہ کرتے ہیں تو ہماری بات کا اثر آہستہ آہستہ زائل ہونے لگتا ہے۔ پھر ہماری ڈانٹ بچوں کے لیے ایک عام سی بات ہو جاتی ہے، وہ اس لہجے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ آزما کر دیکھ لیں جو مائیں، بزرگ اور بڑے اس طرح چھوٹے بچوں پر غصہ کرتے ہیں تو وہ بڑوں کی باتوں پر توجہ دینا چھوڑ دیتے ہیں، سنی ان سنی کرنے لگتے ہیں، ایک طرح کا دفاعی نظام (defence mechanism) بنا لیتے ہیں۔ سوچتے ہیں ان کی تو عادت ہے، یہ تو اسی طرح بات کرتے ہیں، ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر بتاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں کہنا کیا مصیبت ہے! کیا آفت آ رہی ہے! میں تو تنگ آ گئی ہوں اس گھر سے۔ یہ بھی اعتراض میں اسراف ہے۔ ایسی بات کو تکیہ کلام بنا لینا کوئی اچھی خوبی یا خاصیت نہیں۔ سوان الفاظ سے گریز کرنا چاہیے، ایسے الفاظ کے استعمال سے بچنا چاہیے۔

### تنقید کرنے میں اسراف:

تنقید کرنے میں بھی اسراف کیا جاتا ہے۔ کسی نے کوئی کام غلط کیا، کوئی نادانستہ غلطی سرزد ہو گئی، اب جتنی غلطی ہے اسی حد تک تنقید کرنی چاہئے۔ اس میں مبالغہ آرائی کرنا، آسمان وزمین کے قلابے ملانا درست نہیں۔ مخصوص (specific) کر کے بتائیں کہ تم نے فلاں وقت جھوٹ بولا تھا۔ لیکن یہ کہنا کہ تم ہمیشہ ایسے ہی جھوٹ بولتے ہو، یہ تو تمہاری عادت ہی ہے، تم نے کبھی کوئی کام ٹھیک سے کیا بھی ہے، کبھی کوئی ڈھنگ کی بات بھی کر لیا کرو، ہمیشہ جھوٹ بولتے ہو، تم سے کبھی کھانا ٹھیک پکتا ہی نہیں، یہ انداز اختیار کرنا اسراف ہے۔ ان الفاظ کا اثر صرف سننے والے پر ہی نہیں ہوتا بلکہ کہنے



والے میں بھی ہیجان پیدا ہوتا ہے، پارہ اوپر چڑھنے لگتا ہے۔ یہ کہہ دینا کہ تم نے ظہر کی نماز قضا کر دی اور یہ کہنا کہ تم تو روزانہ نماز قضا کر دیتے ہو، ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ دوسری بات سے سامنے والے میں منفی رد عمل پیدا ہوگا، وہ ٹھان لے گا کہ اچھا اب نہیں پڑھوں گا۔ ایک بار نہ پڑھنے پر سارے کیے پر پانی پھیر دیا۔ یہ تنقیدی انداز اچھا نہیں ہے۔

خواتین کی جب اُن کے شوہروں سے لڑائی ہو جائے تو فوراً کہہ دیتی ہیں۔ ”آپ نے تو کبھی خیال ہی نہیں کیا، آپ کی تو ہمیشہ سے یہی عادت ہے۔“ یا پھر ساس نندوں سے لڑائی ہوگئی ان کی بھی ساری اچھائیوں اور خوبیوں کو بھٹلادیا اور کہا کہ ”آپ ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہیں اور یہی کچھ کہتی ہیں۔“ اچھے بُرے حالات آتے جاتے رہتے ہیں کوئی ہمیشہ کے لیے بُرا یا ہمیشہ کے لیے اچھا نہیں ہوتا، اتنی تنگ نظری مناسب نہیں، ذرا وسعت پیدا کرنی چاہیے۔ تعلقات اور معاملات میں جو بات موثر (effective) ہو سکتی ہے، کاٹ دار لہجے اس کو غیر موثر بنا دیتے ہیں۔ غیر ضروری تاکید (over emphasise) بات کو غیر موثر بنا دیتی ہے اور وہ بات تعمیر (construction) کے بجائے تخریب (destruction) کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ انداز ہمارے معاشرے کا مزاج بنتا ہی چلا جا رہا ہے۔

### تعریف میں اسراف:

تنقید کے برعکس تعریف کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ہماری نفسیات میں یہ شامل ہے کہ جو چیز اچھی لگتی ہے اس کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ اور ہمیں اس کی اتنی عادت ہوگئی ہے کہ ایک نارمل تعریف، جائز تعریف تو ہمیں تعریف لگتی ہی نہیں۔ مثال کے طور پر کسی نے دعوت دی، کھانا پکا یا، مہمانوں نے ایک بار کہہ دیا کہ کھانا اچھا تھا تو میزبان کو لگتا ہے شاید کھانا پسند نہیں آیا جب تک ایک ایک نوالہ کھا کر تعریف نہ کریں، گن نہ گائیں، قصیدے نہ پڑھیں، ہمیں لگتا ہی نہیں کہ تعریف کی گئی ہے۔ مبالغے میں یقیناً جھوٹ کا عنصر شامل ہوتا ہے، تو مناسب حد تک تعریف ٹھیک ہے تعریف کے اندر مبالغہ ناپسندیدہ ہے۔

ذاتی طور پر کسی کی تعریف میں مبالغہ مت کریں، اُس کے نفس کو شو اور آزمائش میں مت ڈالیں۔ بخاری اور مسلم میں حدیث موجود ہے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا وہ کسی کی تعریف کر رہا ہے اور تعریف میں مبالغہ کر رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((وَيَلْكَ قَطَعْتَ غَنَقَ صَاحِبِكَ قَطَعْتَ غَنَقَ صَاحِبِكَ مَرَاثِمَ قَالَ مَنْ

كَانَ مِنْكُمْ مَا دَخَا أَحَاةَ لَا مَحَالَةَ فَلْيَقُلْ أَحْسِبُ فَلَانَا وَاللَّهِ حَسْبِينَهُ وَلَا أَرْسِي

عَلَى اللَّهِ أَحَدًا)) (۱)

”آپ ﷺ نے فرمایا انہوں نے اپنے ساتھی کی گردن کاٹ ڈالی تو نے اپنے ساتھی کی گردن کاٹ ڈالی۔ پھر فرمایا کہ اگر کسی کے لیے اپنے کسی بھائی کی تعریف کرنی ضروری ہو جائے تو یوں کہے کہ میں فلاں شخص کو ایسا سمجھتا ہوں، آگے اللہ خوب جانتا ہے، میں اللہ کے سامنے کسی کو بے عیب نہیں کہہ سکتا۔“

اس حدیث سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ حوصلہ افزائی کے طور پر تھوڑی بہت تعریف ہو جائے تو اس کی اجازت ہے لیکن بے حد تعریف (flattery) اسراف اور مبالغہ ہے جو کہ بہت ناپسندیدہ ہے۔ مزید یہ کہ تعریفی کلمات میں اپنی کم علمی کا اعتراف اور اللہ کے کامل علم کا ذکر بھی کرنا چاہیے تاکہ تعریف میں اُس کے غلط ہونے کی گنجائش رہے۔

تعریف سُن کر انسان کا نفس موٹا ہوتا ہے، کان منتظر ہوتے ہیں کہ لوگ آکر میرے کام کی تعریف کریں۔ اس میں دکھاوا شامل ہوتا ہے، نیت کے اندر بگاڑ آتا ہے۔ جب لوگوں سے تعریف سننے کا شوق پیدا ہوتا ہے تو اللہ سے اجر پانے کا شوق مدہم پڑتا چلا جاتا ہے۔ ایک انسان اگر فرض سمجھ کر کام کرے، اس کو نیکی سمجھ کر کرے، اللہ کے لیے کرے اور لوگوں سے ہرگز صلہ نہ چاہے تو اُس کو لوگوں کی تعریف پر کان نہیں دھرنے چاہئیں۔ تعریف میں مبالغہ اور اسراف بہت ناپسندیدہ ہے اور اس کے اندر پھر جھوٹ بھی شامل ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ نے کسی کو بہت عرصہ بعد دیکھا تو پتہ چلا کہ اس نے وزن کم (dieting) کیا ہے۔ اب آپ اُس کی اس طرح تعریف کریں کہ بہت جوان (young) لگ رہے ہو، حالانکہ بعض اوقات وزن گھٹا کر انسان زیادہ بوڑھا لگنے لگتا ہے، تازگی ختم ہو جاتی ہے۔ تو تعریفوں کے پُل باندھنے کے بجائے بس اتنا کہہ دیں کہ آپ کا وزن کم لگ رہا ہے۔ ساتھ جھوٹی تعریفیں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کہ آپ تو جوان ہو گئی ہیں، بیس سال کی لگ رہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کائنات میں صرف ایک ہی ہستی ہے جس کی تعریف میں اسراف نہیں ہو سکتا اور وہ اللہ کی ذات ہے۔ اُس کی جتنی تعریف کی جائے، جتنی حمد و ثنا کی جائے کم ہے، اللہ کے بہت سارے نام مبالغہ کے صیغوں میں آتے ہیں مثلاً غفور بہت بخشنے والا، رحمن بے پناہ رحم کرنے والا وغیرہ۔ لیکن انسانوں کی تعریف میں مبالغہ کیا جائے، غلو کیا جائے تو یہ چیز شرک تک لے جاتی ہے۔

تعریف اور تعظیم میں اسراف سے بہت بچنے کی ضرورت ہے۔ حوصلہ افزائی کی حد تک تعریف کریں، معاشرتی روابط (social contact) کو خوشگوار بنانے کی حد تک کریں، اس سے زیادہ نہیں۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الشهادات، باب اذاز کمی رجل رجلا کفاه



جیسے اگر کسی نے بہت محنت سے کھانا پکا یا ہے، اچھا پکا یا ہے تو کہہ دیجئے کہ اچھا پکا یا ہے۔ کوئی لباس اچھا لگ رہا ہے تو تعریف کر دیں کہ یہ لباس آپ پر اچھا لگ رہا ہے کوئی حرج نہیں لیکن اسراف اچھا نہیں۔

### جذبات کا اسراف:

اسی طرح جذبات کا اسراف (emotionally extravagant) بھی ہم اپنے معاشرے میں کثرت سے دیکھتے ہیں، لوگوں کا ایک ڈرامائی سا انداز (melodramatic style) بن گیا ہے۔ کسی کا انتقال ہو جائے تو قریبی رشتہ دار غمگین ہوتے ہیں، روتے بھی ہیں لیکن اگر بے ہوش نہیں ہو رہے، دورے نہیں پڑ رہے، محض خاموشی سے آنسو بہا رہے ہیں، زبان سے کچھ نہیں بول رہے جو کہ عین سنت طریقت ہے، تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ان لوگوں کو غم ہی نہیں ہے، اور اگر کوئی بین کرتا ہے، دھاڑیں مار مار کر روتا ہے، غش کھاتا ہے، منہ پیٹتا ہے، سر کے بال نوچتا ہے تو ہی سمجھتے ہیں کہ ان لوگوں کو غم ہے۔ کیوں کہ لوگوں کو تماشا دیکھنا اچھا لگتا ہے، جو لوگوں کو متاثر کرتا ہے، پھر جگہ جگہ ایسے دادیلے کا چرچا ہوتا ہے، یہ اسراف ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے غم کے اظہار کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ لہذا سوگ منانے میں آپ ﷺ کی تعلیمات کو مد نظر رکھنا چاہیے۔

دوسری چیز یہ کہ ایسے موقعوں پر ہم وقت کا بھی بہت اسراف کرتے ہیں۔ مثلاً کسی گھر میں اگر انتقال ہو جائے تو اولاد یا قریبی رشتہ دار سب سے پہلے کیا کرتے ہیں کہ تین دن کی چھٹی لے کر گھر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں طے شدہ (understood) ہے کہ غم کے ساتھ چھٹی تو ضروری ہے۔ جب کہ سوگ منانا اور چیز ہے اور کام کو معطل کر دینا مختلف چیز ہے۔ ہمارے ہاں تعطیل کا مغربی تصور (modern concept) ہے۔ اگر آپ نبی اکرم ﷺ کی سیرت پڑھیں تو حیران رہ جائیں گے۔ ایک طرف آپ ﷺ کی صاحبزادی کا انتقال ہوا اور دوسری طرف آپ نے بدر کی جنگ لڑی۔ یہ سرگرمی اپنی جگہ، مبنی کا غم اپنی جگہ۔ آپ یہ کہیں نہیں پڑھیں گے کہ کسی کے انتقال کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ تین دن کے لیے سب سے کٹ کر بیٹھ گئے یا پھر میت کے اقرباء کو تلقین کی کہ الگ تھلگ بیٹھ جاؤ، کوئی کام نہ کرو۔ خوشی نہ منانا اور چیز ہے اور کوئی کام نہ کرنا دیگر چیز ہے۔ اس کے بعد عید بھی آئی اس لیے کہ غزوہ بدر رمضان میں ہوئی تھی تو سب نے عید کی خوشیاں بھی منائیں۔ اس لیے کہ اسلام میں سوگ تین دن کا ہے۔ یہ حیرت انگیز توازن (amazing balance) آپ کو سیرت میں نظر آئے گا۔ ہم نے تو اس کو لازم و ملزوم کر لیا کہ اگر میت کے گھر والے کام کر رہے ہیں تو یہ مرنے والے کی بے حرمتی ہے اور اس کو مرنے والے کا غم نہیں، جس نے غم نہ منایا اس نے مرنے والے کی تعظیم نہ

کی۔ دراصل کام کرنے سے غم دور ہوتا ہے اسی لیے انسان جلد از جلد مصروف ہو جائے تاکہ زندگی معمول پر آجائے۔ یہ جذبات کا اسراف ہے اور غور طلب بات یہ ہے کہ اگر گھر میں بیٹھ کر قرآن پڑھا جائے اور ایصالِ ثواب کیا جائے تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا لیکن اگر کسی کی موت پر کوئی قرآن پڑھانے کہیں اور چلا گیا یا قرآن پڑھنے کے لیے گھر سے باہر کہیں چلا گیا تو تنقید کریں گے، برا بھلا کہیں گے، بڑے دیندار بنتے ہیں آج بھی کلاس لینے چلے گئے۔ گو یا صرف قرآن پڑھنے کو نیکی نہیں سمجھتے بلکہ وہاں بیٹھ کر پڑھنے کو نیکی سمجھتے ہیں۔ جو اس دنیا سے چلا گیا ہم اس کو استغفار کا تحفہ بھیج سکتے ہیں، اگر ہمارا کوئی قریبی رشتہ دار تھا، تو ہم ان کے لیے صدقہ جاریہ بننے کی کوشش کریں۔ لیکن ایک رسم بن گئی ہے کہ سب بیٹھے رہیں، روتے رہیں اور اس طرح سے جذبات میں اسراف کرتے رہیں۔

خوشی کے موقعوں پر بھی آپ کو یہی اسراف محسوس ہوگا۔ خوش ہوں گے تو بے پناہ خوشیاں منائیں گے، بلند آواز، تہقہ، ٹھٹھے اور شادی بیاہ کے موقع پر تو اسراف ہی اسراف نظر آتا ہے، اس میں بالکل توازن برقرار نہیں رہتا۔ یہ جذبات میں اسراف کہ خوش ہوئے تو بے تحاشا خوش، افسردہ ہوئے تو بے انتہا افسردہ۔ یہ پنڈولم کی سوئی جو یا تو اس انتہا پر ہوتی ہے یا اس انتہا پر، یہ انسان کو پریشانیوں (anxiety) میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ روش کہ بے حد خوش یا انتہائی افسردہ (down in the dumps) ہونا بہت نقصان دہ ہے۔ جب جذبات میں اسراف ہوگا تو وقت کا اسراف بھی ضرور ہوگا۔

### خوشی غمی کے موقع پر وقت کا اسراف:

ہماری شادیاں دیکھ لیں کہ جس طرح سے یہ ہمارے دین، ایمان اور وقت کی آزمائش بنی ہوئی ہیں۔ اللہ کی پناہ! اگر گھر میں شادی ہے پھر تو کوئی تصور نہیں کر سکتا کہ چھٹی نہ لی جائے۔ اب سب چھٹی لے کر گھر میں بیٹھے رہیں گے، سارے دفتری کام معطل کر دیے جائیں گے۔ خواہ دفتر میں کتنا اہم کام ہو، آپ کی کتنی ضرورت ہو، لیکن نہیں! ہمارے گھر میں تو شادی ہے، ہم تو دفتر آ ہی نہیں سکتے۔ یہ اسراف کا مظاہرہ ہے۔ گھر میں بیٹھ کر ایسا کیا کر رہے ہیں جو کہ آپ دفتری معمولات کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم شادی کو سنت طریقہ تک محدود کریں تو سب کچھ چل سکتا ہے لیکن اگر ہم اس کو سنت سے ہٹا دیں گے تو ہم ضرور اسراف کریں گے۔

اسراف کے مقابلے میں ہم سادگی اختیار کرنے کی بات کرتے ہیں لیکن ہم سادگی کی مکمل تعریف (definition) نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ امیر کی سادگی کا معیار الگ ہے اور غریب کا الگ،



تو اگر ہم سنت کی بات کریں اور اس پر قائم رہیں تو سنت ہمیں اسراف سے بچالیتی ہے اور زندگی معتدل راہ پر چلتی رہتی ہے، انسان اسراف کا شکار نہیں ہوتا۔

گھر میں شادی ہے تو خوشی ضرور منائیں مگر ساتھ ساتھ اپنے کام بھی نہٹائیں۔ یہ بالکل ممکن ہے، دونوں کام اکٹھے کیے جاسکتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ چھٹی لینا کوئی گناہ ہے یا یہ کوئی حرام کام ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خوشی اور غم کے موقعوں پر ذمہ داریوں کو ٹالنا (suspend) نہیں چاہیے۔ یہاں تک کہ معمول کے مطابق زندگی کو چلانے کی ضرورت ہے۔ اور اپنا وقت اس طرح سے ترتیب (manage) دیں کہ زندگی کے معاملات کا بھی حرج نہ ہو اور دفتری ذمہ داریاں بھی انجام پذیر ہو جائیں۔ ہمارے اسی طرز عمل کی وجہ سے ہمارے دفاتر میں کثرت سے نانغے اور چھٹیاں ہوتی ہیں اور کام کا حرج ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس ہم گھر میں کام کرنے والیوں کی چھٹیوں سے پریشان ہوتے ہیں کہ ان کے گھر کوئی خوشی کا یا غم کا موقع آتا ہے تو گھر بیٹھ جاتی ہیں اور کتنا کام کا حرج ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم بھی تو یہی کرتے ہیں! ہماری محافل رات رات بھر جی رہتی ہیں، دو دو ہفتے مختلف پروگرام چل رہے ہوتے ہیں، مایوں ہے، مہندی ہے، دلہن کے گھر آنا جانا، دولہا کے گھر آنا جانا لگا رہتا ہے، اور اس وجہ سے دفتر کی چھٹیاں ہوتی ہیں۔ یہ وقت کا اسراف ہے، قوت (energies) کا اسراف ہے، مال و دولت کا اسراف ہے۔

### عام زندگی میں وقت کا اسراف:

عام زندگی میں بھی ہم وقت کا بہت اسراف کرتے ہیں۔ جو کام دس منٹ میں ہو سکتا ہے اس پر آدھا گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ بننے سنور نے (make up) میں، نہانے دھونے میں، بازاروں میں گھومنے پھرنے میں، بہت سا وقت بلا ضرورت ضائع ہوتا رہتا ہے۔ فون پر غیر ضروری باتیں کرنا، ادھر ادھر کی لغو باتیں کرنا، یہ تمام باتیں اسراف میں آتی ہیں۔ دراصل ہمیں اپنا کام مناسب وقت میں سمیٹنا نہیں آتا۔ وقت کی قدر کریں، دنیا میں ہم آخرت کمانے کے لیے آئے ہیں، تو ہمارے لیے وقت ہی سب سے بڑی متاع ہے۔ اگر آخرت کمانے کا تصور دماغ میں تازہ رہے گا تو وقت کی قدر آئیگی۔

ایک صورت ایسی ہے جس میں فون پر بات کرنا اسراف میں شامل نہیں ہوگا، خواہ ایک گھنٹہ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ماں باپ دور رہتے ہوں، یا دوسرے ملک میں مقیم ہوں تو پھر فون پر بات کرنی چاہیے۔ یہ ایک طرح سے والدین کا حق کسی درجے میں ادا کرنے کی کوشش ہے۔ اور یہ عبادت بھی ہے کہ ماں باپ کا دل بہلایا جائے، اپنی مصروفیات میں سے اُن کے لیے وقت نکالا جائے۔ لیکن یاد رکھیں عبادت میں پھر غیبت، جھوٹ، دل دکھانے والی طنز یہ گفتگو نہیں ہوتی۔

## اسراف کا تعین:

فقہاء کرام نے مقاصد شریعت کے تحت انسانی اعمال کی تین اقسام کی ہیں۔ سب سے پہلی ”الضروریات“ یعنی وہ امور جن پر دینی و دنیاوی بقا موقوف ہے۔ مثلاً دین کا تحفظ، جان کا تحفظ اور عقل کا تحفظ۔ اسی طرح ”الحاجات“ میں ایسے امور شامل ہیں جو زندگی اور موت کا مسئلہ تو نہیں ہوتے لیکن ان کا تعلق تنگی و راحت، مشکل و آسانی سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر نماز کو قصر کرنا، کھانے پینے، رہن سہن میں اچھی چیزیں استعمال کرنا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ سطر پوش لباس پہننا ضروریات میں سے ہے اور ایسا لباس جو کہ پورے بدن کو ڈھانپ لے، اچھا لباس ہو، یہ پہننا حاجات میں سے ہے۔ تیسری قسم ”التحسینیات“ ہے، اس کو مروت کا تقاضا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اعمال میں ”التحسینیات“ کے نہ ہونے کی وجہ سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا، البتہ حُسن کا تقاضا ہے کہ ان کو اختیار کیا جائے۔ مثلاً نماز میں زینت اختیار کرنا، نفیس لباس پہننا وغیرہ۔

اسراف کا تعین کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے محض ”الضروریات“ پر زندگی گزارنے کا نہیں کہا بلکہ ”الحاجات“ اور ”التحسینیات“ کی رعایت بھی دی ہے۔ ہو سکتا ہے ہم کسی شے کو اسراف سمجھ رہے ہوں جب کہ اللہ کی نظر میں وہ شے نہ صرف جائز ہو بلکہ قابل تحسین بھی ہو۔

## میے میں اسراف:

اسراف کا ذکر سن کر سب سے پہلے جو خیال آتا ہے وہ مال و دولت اور پیسہ خرچ کرنے کے بارے میں آتا ہے۔ سب سے پہلے اس تصور کو ذہن سے نکال دیں کہ پیسہ خرچ کرنا اسراف ہے۔ پیسہ خرچ کرنا اپنی ذات میں اسراف نہیں ہے۔ اسی طرح ضرورت کے سوا خرچ کرنا بھی اسراف نہیں ہے، خواہشات پر خرچ کرنا بھی اپنی ذات میں حرام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت دے کہ ہم اسراف کے بارے میں صحیح تصور قائم کر سکیں۔

میے میں اسراف یہ ہوگا کہ بلاوجہ، بلا ضرورت یا زائد از ضرورت (extra) خرچ کرنا، جس کی کوئی ضرورت نہیں، چیزیں خریدتے چلے جانا، جمع کرتے جانا، نہ خود استعمال کرنا اور نہ دوسروں کو دینا۔ مثال کے طور پر ایک گھرانہ ہے جس میں گل چھ افراد ہیں۔ چار بچے ہیں ایک اتنی اور ایک لبا۔ ان کی ضرورت ہے کہ ان کے گھر میں چھ کمرے ہوں یا چھ رضائیاں ہوں۔ لیکن یہ لوگ بیس کمرے اور رضائیاں لاکر رکھ لیں تو یہ اسراف ہے۔ ایک اور مثال دیکھیں فرض کریں ایک اور گھرانہ بھی چھ افراد پر مشتمل ہے لیکن ان کے ہاں مہمان داری بہت ہوتی ہے، عزیزوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، تو مانگ



تا نگ کر بستر پورے کرنا اچھی بات نہیں۔ ایسی صورت میں چاہیے کہ کچھ رضائیاں یا کمبل زائد ساز ضرورت بھی رکھ لیں جو بوقت ضرورت کام آجائیں۔ یہ اسراف نہیں ہے کیوں کہ اللہ نے ان کو استطاعت بھی دی ہے اور ضرورت بھی ہے۔

اسراف دراصل یہ ہے کہ ایک دفعہ کپڑا پہنا یا ایک دفعہ جوتا پہنا اور پھر صندوق میں رکھ دیا، اور پھر مزید خریدنے چلے گئے۔ یہ درست نہیں، جائز نہیں، پسندیدہ نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہے اور خرید بھی سکتے ہیں تو ضرور خریدیں۔ گاڑی ہو، گھر ہو، زیور ہو، کپڑا ہو کوئی بھی استعمال کی چیز ہو، یہ سب خریدنا درست ہے۔

### خواہشات اور اسراف:

اب ہم آتے ہیں خواہشات کی طرف یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خواہشات کو پورا کرنا اسراف ہے؟ اگر کسی چیز کو خریدنے کی خواہش دل میں جنم لیتی ہے اور اس کو خریدنے کی استطاعت ہے تو خرید لیں، اپنی خواہش پوری کر لیں لیکن ضائع نہ کریں۔

آپ کے پاس پچھلے سال کے گرم سردیوں کے کپڑے پڑے ہیں لیکن بازار میں نئے پرنٹ (print) دیکھ کر خریدنے کو دل چاہا تو حسب استطاعت خرید لیں۔ پہلے والے کسی ضرورت مند (deserving person) کو دے دیں، یہ اسراف نہیں۔ اسراف یہ ہے کہ ہر موسم کے کپڑے خریدنا لازم سمجھیں اور خرید خرید کر کپڑوں کا ڈھیر لگا دیں، لیکن نہ خود پہننے کی نوبت آئے اور نہ کسی کو خیرات کریں۔ اور یہ بھی اسراف میں شمار ہو گا کہ کسی ایسی چیز کی خواہش کریں جو خرید (afford) نہ کر سکیں، قرض لے کر یا حرام ذرائع سے کمنا خواہشات پوری کریں یہ اسراف ہے۔

یہاں ایک بات سمجھ لیں کہ خواہشات کے معاملے میں احوال و ظروف سے پتہ چلے گا کہ اس میں اسراف ہو رہا ہے یا نہیں، ہو سکتا ہے کسی صاحب استطاعت کے لیے ایک چیز اسراف نہ ہو جب کہ تھوڑی کم حیثیت کے لیے وہی چیز اسراف میں داخل ہو۔ مثال کے طور پر ایک عورت کے خاوند کی آمدنی دس پندرہ ہزار ہے اور وہ پانچ ہزار کا جوڑا خریدنا چاہتی ہے یا کوئی سونے کی چیز خرید لیتی ہے تو یہ اسراف ہے۔ لیکن کوئی ایسی عورت جس کے شوہر کی تنخواہ پانچ لاکھ ہے اور وہ پانچ ہزار کا جوڑا یا زیور خریدنا چاہے تو یہ اسراف نہیں۔ لہذا کچھ معاملات میں اسراف کی تعریف (definition) امیر اور غریب کے لیے الگ الگ ہے۔

ابھی صرف اسراف کی بات ہو رہی ہے، ہو سکتا ہے کسی شخص کے لیے ایک چیز خریدنا جائز ہو لیکن وہ استعمال کرتے ہوئے دکھاوا اور نمائش کرنے لگے تو وہی جائز چیز اب باعث گناہ ہو جائے

گی۔ راہبانہ طرز زندگی (monastic way of life) میں یہ تصور تھا کہ اچھی چیز اگر خرید سکتے ہو تب بھی مت خریدو۔ ایسی سادگی اسلام میں یقیناً پسندیدہ ہے لیکن ہم ابھی حلال اور حرام کی بات کر رہے ہیں، گناہ و ثواب کی بات کر رہے ہیں، حدود و قیود (border line) کی بات کر رہے ہیں، تو انسان کے خرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس پر کوئی گناہ نہیں ملے گا۔

### نمود و نمائش اور اسراف:

جہاں تک دکھاوے اور نمائش کا تعلق ہے تو وہ سراسر گناہ ہے۔ ایسا خرچ کرنا جس میں فضول خرچی کے ساتھ دکھاوا بھی ہے، یا کفار اور مشرکین کے تہوار منانے پر خرچ کیا جا رہا ہے، بے ثمر، بلا ضرورت، بے محل، یہ دراصل اللہ کی نافرمانی میں خرچ ہو رہا ہے، ان کو عزت دی جا رہی ہے جن کو اللہ نے عزت نہیں دی جو اللہ کے نافرمان ہیں۔ ہم ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں جن کے طور طریقہ پر عمل کرنے سے، جن کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ گناہ ہی کے زمرے (category) میں چلا جائے گا اور اس طرح بلا ضرورت، دکھاوے اور نمائش کے لیے روپیہ پیسہ خرچ کرنا تو پھر تہذیب بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{إِنَّ الْمُبْتَدِرِينَ كَالْوَأَخْوَانِ الشَّيْطَانِ} {بنی اسرائیل: ۲۷}

”تہذیر کرنے والے شیطان کے بھائی ہوتے ہیں۔“

### اسراف کی حدود اور اس سے بچنے کی تدبیر:

یہ جاننا ضروری ہے کہ کہاں اسراف کیا جا رہا ہے اور کہاں نہیں۔ چند ایک تو بالکل واضح نقاط (solid concrete) ہیں جو ہم خود جان سکتے ہیں اور محسوس کر سکتے ہیں۔ اور دوسری چیز جو انسان کو اسراف سے روکتی ہے وہ اس کا تقویٰ ہے۔ اس کے اندر جو خوف خدا ہے، اس کا جو ضمیر ہے وہ اسے راہ دکھائے گا، بتائے گا کہ حد کہاں پر ہے، کس حد تک ضرورت ہے اور کتنی دنیا کی محبت ہے، کتنی دنیا سے بے رغبتی ہے۔ ہر شخص کا اس لیے انفرادی محاسبہ ہوگا۔ خود انسان سادگی سے رہے بہت اچھی بات ہے۔ اپنی خواہشات کو روکے (control) رکھے اور ضروریات پر کم سے کم خرچ کرے، خواہشات ختم کرنے کی کوشش کرے۔ مگر اس طرز عمل کو اپنے اعلیٰ ہونے کی دلیل نہ سمجھے اور نہ دوسروں کو تحقیر اور تنقید کی نظر سے دیکھے۔ دوسروں کی غیبت کرنا یا باتیں بنانے لگ جانا بھی نہایت ناپسندیدہ رویہ ہے اور نیکیوں کو غارت کرنے کا باعث ہے۔

بعض لوگوں کو مہنگی چیزیں پسند ہوتی ہیں، طبیعت شاہانہ ہوتی ہے اور بعض سستی چیزیں



خریدتے ہیں۔ اب ہمیں فیصلہ (judge) نہیں کرنا کہ کون اسراف کر رہا ہے اور کون میانہ روی پر ہے۔ یہ دراصل نیت پر شک کرنا ہے کہ فلاں دکھاوے اور نمائش کے لیے ایسا کرتے ہیں، کچھ لوگ مہنگی چیزیں اس لیے لیتے ہیں کہ یہ پائیدار ہوتی ہیں، جلدی خراب نہیں ہوتی، اس وجہ سے مہنگی اشیاء لینا ٹھیک ہے۔ کچھ لوگ مہنگی چیزیں صرف منفرد ہونے کے لیے لیتے ہیں یہ غلط ہے۔ اپنے لیے سادگی اختیار کرنا یقیناً عزیمت کا راستہ ہے، انبیاء اور اولیاء کا راستہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ اگر اپنے لیے یہ معیار قائم کر لیا کہ کم سے کم پر گزارہ کرنا ہے تو بہت اچھی بات ہے لیکن اوروں کو اس طرز پر گھسیٹ گھسیٹ کر لانا اور اپنے آپ کو معیار بنا کر پیش کرنا کہ میں کتنی اچھی یا کتنا اچھا ہوں اس کی بالکل ضرورت نہیں۔ خود کو اعلیٰ (superior) نہیں سمجھنا اور دوسروں کو ان کے طرز زندگی کی وجہ سے حقیر اور کمتر نہیں سمجھنا۔ بس انسان یہ سوچ لے کہ جتنا جمع کیا یا جتنا خرچ کیا ان سب کا حساب دینا ہوگا۔

**اسراف کے متعلق اصل تصور:**

ایک چیز جو ہمارے ذہنوں میں بیٹھ چکی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی بھی مہنگی چیز خریدنا اسراف ہے یہ تصور ہمارے معاشرے میں بہت عام ہے مگر یہ تصور درست نہیں۔

آپ کے پاس قیمتی کپڑے ہیں آپ ان کو ستے صابن سے دھوئیں گے تو وہ خراب ہو جائیں گے، زیادہ عرصہ نہیں چل سکیں گے۔ اس لیے آپ تھوڑے زیادہ پیسے خرچ کر کے اچھی (quality) والا اسراف استعمال کریں۔ اب اس کو اسراف کہہ دینا شدت پسندی ہے۔

فضول خرچی میں اور مہنگی چیز خریدنے میں فرق کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر مہنگی چیز خریدنا فضول خرچی نہیں ہوتی۔ بعض لوگ اسراف کی یہ تعریف (definition) کرتے ہیں کہ ضرورت کی چیز پر ضرورت سے زائد خرچ کرنا اسراف ہے اگر ضرورت کی چیز پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف ہوتا تو پھر اسلام میں جائز خواہشات پوری کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی، ہم سے کہہ دیا جاتا کہ خالی ضروریات (needs) کی سطح (level) پر زندگی گزارو۔ ضروریات زندگی کی حد تک چیزیں خریدو، خواہشات پر پیسہ خرچ کرنا گناہ قرار دیا جاتا۔ اگر اسلام یہ مزاج اختیار کرتا تو ہم رہبانیت کی طرف چل پڑتے۔ رہبانیت کا مزاج یہی ہے کہ اپنے نفس کی کسی خواہش کو پورا مت ہونے دو۔ خواہشات تو گناہوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ حالانکہ ایسی بات نہیں، انسان کے اندر اللہ نے کچھ فطری خواہشات رکھی ہیں انسان کی فطرت ہے کہ خوبصورت اچھی چیز حاصل کرنا چاہتا ہے، حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جائز خواہشات پوری کرنے کی گنجائش رکھی ہے۔

البتہ وہ خواہشات جو کہ شریعت کی حدود کو توڑ کر پوری کی جائیں اُن سے روکا گیا ہے کہ یہ چیز اسراف اور تبذیر میں شمار ہوتی ہے۔

سونا پہننے میں اسراف یہ ہوگا کہ بہت سارا سونا خرید لیا مگر زکوٰۃ ادا نہ کی۔ آپ زکوٰۃ نہیں دے سکتے تو سونا کیوں خریدا؟ چاہے آپ کے پاس ہزار تولہ سونا ہے مگر آپ اُس کی زکوٰۃ باقاعدگی سے دیتے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ بس زکوٰۃ کا برابر حساب رکھیں، ہر سال زکوٰۃ ادا کرتے رہیں، تاکہ کل اللہ کے سامنے حاضر ہوں تو حساب دینا آسان ہو جائے۔ تو فتویٰ اور ہے تقویٰ اور ہے۔ فی الحال ہم فتوے کی بات کر رہے ہیں۔ تقویٰ کی بات نہیں کر رہے ہر انسان کے تقوے کا الگ معیار ہوتا ہے۔ جہاں تک فتوے کا تعلق ہے تو سونا خریدنے کی بھی اجازت ہے اور پہننے کی بھی اجازت ہے اور اللہ نے کوئی حد بھی نہیں بتائی کہ بس دو تولہ سونا خرید سکتے ہو اس سے زیادہ مت خریدنا۔ اسی طرح لباس ہماری ضرورت ہے، کسی طرح کا بھی لباس پہن کر یہ ضرورت پوری کی جاسکتی ہے تو اللہ نے ریشم کیوں بنایا؟ کیا ریشم پہننا گناہ ہے۔ ریشم وغیرہ ہمیشہ سے منگے کپڑے رہے ہیں، تو کیا ان کو پہننا گناہ ہے؟ اگر ریشم پہننا اسراف ہوتا تو پھر تو یہ گناہ ہوتا۔ یہ سوچ دراصل اسلام کے مزاج کے خلاف ہے، راہبانہ طرز زندگی (monastic way of life) کی ایک شکل ہے جو کہ انسان کی خوشیوں کا گلا گھونٹنے کا غیر فطری طریقہ ہے۔ جب زندگی میں اتنی شدت پسندی اختیار کی جاتی ہے تو زندگی میں خشکی آنے لگتی ہے، روکھاپن آنے لگتا ہے اور مزاجوں میں تلخی اور سختی آنے لگتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں جو اللہ نے انسانوں کے لیے بنائی ہیں ان سے انسان وقتی طور پر ذرا خوش ہو جاتا ہے، طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے، پھر عبادت میں مزید دل لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معیارات مختلف ہیں۔ سورہ حجرات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ} (۱۳)

”اللہ کے نزدیک سب سے باعزت وہ ہے تم میں سے جو سب سے زیادہ تقوے والا ہے۔“

اللہ نے یہ تو نہیں کہا کہ اللہ کی نظر میں سب سے بہتر اور اعلیٰ وہ ہے جو ہیرے جوہرات نہیں خریدتا یا ریشم نہیں پہنتا۔ حضرت سلیمان عليه السلام بہترین لباس پہنتے تھے، تخت وتاج کے مالک تھے لیکن صاحب تقویٰ بھی تھے۔ اللہ کی نظر میں بھی بہت اعلیٰ تھے۔ اس کے برعکس کوئی دین دشمن ہو سکتا ہے اچھا لباس نہ پہنتا ہو، درویش صفت ہو لیکن اللہ کی نظر میں باعزت نہ ہو، تو معیار تو تقویٰ ہے۔ اب اگر سونا نہ خریدنے والی خاتون اپنے بارے میں عجب کا شکار ہو جائے، احساس برتری کا شکار ہو جائے کہ میں کتنی مہنگی ہوں کہ میں سونا خرید سکتی ہوں تب بھی نہیں خریدتی، اور یہ کیسی دنیا دار عورت ہے



قرآن پڑھتی ہے اور پھر بھی مہنگی مہنگی چیزیں خریدتی ہے تو یہ عورت غلطی پر ہے۔ لوگوں کے اپنے اپنے مزاج ہوتے ہیں، کسی کو شوق ہوتا ہے کسی کو شوق نہیں ہوتا۔ حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سونا اور ریشم مسلمان امت کے مردوں پر حرام کیا ہے خواتین پر حرام نہیں کیا وہ پہن سکتی ہیں۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ آتا ہے۔ جب وہ چھوٹے تھے تو ایک دفعہ گر گئے اور رونے لگے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اٹھایا، پیار کیا، کپڑے جھاڑے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے کپڑے جھاڑتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اسامہ اگر تو بیٹی ہوتا تو ہم تجھے اچھے اچھے کپڑے پہناتے، زیور پہناتے۔ دیکھیں اس حدیث سے کتنی ہدایات نکلتی ہیں، مثلاً ایک یہ کہ بننا سنورنا عورتوں کی فطری خواہش ہے۔ اگر زیور گناہ کا کام ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ کہتے کہ اسامہ اگر بیٹی ہوتا تو ہم اس کو زیور پہناتے۔

ہم متقی ہونے کا مطلب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ متقی وہ ہے جو اپنی کسی بھی خواہش کو پورا نہیں کرتا اور جو زیادہ متقی ہے وہ نہ صرف اپنی خواہش پوری نہیں کرتا بلکہ کسی اور کی بھی خواہش پوری ہوتے نہیں دیکھ سکتا، اس پر فوراً اسراف کا فتویٰ لگا دیتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی کبھی کبھار خوب صورت لباس پہنا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیمتی لباس پہننے کا بہت شوق تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے پہنا کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ ایسا لباس پہننا اسراف نہیں ہے۔ امام مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اکثر نیا جوڑا پہنتے تھے۔ تو کیا وہ معاذ اللہ مسرف (اسراف کرنے والے) تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پہن کر اپنے کسی شاگرد کو دے دیا کرتے تھے۔ تو یہ اسراف نہیں ہے۔

یاد رکھیے اسراف یہ ہے کہ چیزوں کو لے لے کر جمع کرتے جانا، نہ خود استعمال کرنا اور نہ دوسروں کو استعمال کرنے دینا۔ ایک دفعہ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آیا اور عرض کی کہ میں چاہتا ہوں میرا لباس بہت خوبصورت ہو، میرا جو تا بھی خوبصورت ہو، یہاں تک کہا کہ میرا کوڑا بھی خوبصورت ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

((اللَّهُ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ))<sup>(۱)</sup>

”اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے۔“

ہم کیسے کسی کو فتویٰ دے سکتے ہیں کہ سستی گاڑیوں میں بیٹھنے والے تو جنت میں جا سکتے ہیں لیکن مہنگی گاڑی چلانے والے جنت میں نہیں جائیں گے۔ یہ باتیں اچھی طرح سمجھ لیں، کہیں ایسا نہ

ہو کہ کل ہم قرآن پڑھ کر نکلیں تو ہم انگلی اٹھا اٹھا کر ہر ایک پر تنقید (condemn) کریں کہ فلاں اسراف کرتا ہے، فلاں بھی اسراف کرتا ہے، جو یہ کرتا ہے وہ فضول خرچ ہے، جو فلاں گاڑی خریدتا ہے وہ تقویٰ سے عاری ہے وغیرہ وغیرہ۔ مثلاً ایک شخص مرسیڈ بیز استعمال کرتا ہے یا ذاتی جہاز کا مالک ہے تو کیا وہ جہنم میں جائے گا؟ ہاں مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب دکھا دیا جائے، اترایا جائے، اس سے بچنا چاہئے۔

دنیا میں ایسے متقی پرہیزگار، پابند صوم و صلوات ہیں جنہیں اچھا کھانا پینا اور اچھا اوڑھنا پہننا اچھا لگتا ہے، ان کو اس بات سے مطلب نہیں ہوتا کہ انہیں کوئی دیکھ رہا ہے یا کوئی نہیں دیکھ رہا۔ اللہ نے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا ہے تو ان نعمتوں کا انہماق نقصان دہ نہیں ہے۔ اس سے ان کی پرہیزگاری متاثر نہیں ہوتی۔

اب ایک ایک چیز کو ہم ناپنے تو لے بیٹھ جائیں گے تو زندگی اسی جہاد میں گذر جائے گی، اپنے آپ سے گشتیاں لڑتے رہیں گے۔ خواہشات کو پورا کرنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ خواہشات دل و دماغ سے اتر جاتی ہیں، مثلاً بازار گئے، ایک کپڑا دیکھا، اتنا پیارا لگا کہ حواسوں پر چھا گیا، نماز پڑھ رہے ہیں تو یاد آ رہا ہے، قرآن پڑھنے بیٹھے ہیں تو وہی ذہن میں چل رہا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ اُس کو خرید لیں تاکہ آپ کے حواسوں سے اتر جائے۔ جب ایک چیز انسان کے پاس آ جاتی ہے اس کی وقعت ختم ہو جاتی ہے (Get it out of your system.) جب اللہ نے اجازت دی ہے تو کیوں اپنے آپ کو مشقت میں ڈالیں۔ اصل میدان لڑائی کا یہ ہے کہ اپنے نفس کو صغیرہ کبیرہ گناہوں سے روکا جائے۔

### کھانے میں اسراف:

انگلی چیز ہے کھانے میں اسراف۔ غور کریں اللہ تعالیٰ نے کیا کچھ نعمتیں ہمارے کھانے کے لیے بنائی ہیں، ان میں ساگ ترکاری بھی ہے، جانوروں کا گوشت بھی ہے۔ اللہ کے دسترخوان میں خشک میوے (dry fruits) بھی ہیں، سستے سے لے کر مہنگے تک سب شامل ہیں، بادام، پستے، چلغوزے یا کاجو، جو بہت مہنگے ہیں اور مونگ پھلی وغیرہ، جو کہ سستی ہیں، یہ تمام چیزیں اللہ کی نعمتیں ہیں۔ اسراف یہ ہے کہ آپ کوئی چیز خرید کر گھر لائے۔ سب نے کھائی، مہمانوں کو بھی دی مگر گھر کے خادین کو کھانا نصیب نہ ہو، اُن کو ہاتھ لگانے کی قطعاً اجازت نہ ہو۔ یہ زیادتی ہے وہ بھی انسان ہیں، اُن کا بھی دل چاہتا ہے، ان کو بھی اپنے ساتھ کھلایا کریں۔

اگر اللہ نے استطاعت دی ہے تو مہنگے سے مہنگا میوہ کھائیں مگر گھر میں سب کے ساتھ مل کر کھائیں۔ نوکروں اور ملازموں کا بھی حصہ نکالیں۔ کھانے میں اسراف کا تعلق مہنگے یا سستا ہونے



سے نہیں ہے۔ اصل اسراف یہ ہے کہ کھانے کو زندگی کا مقصد (live to eat) ہی بنا لیا جائے۔ یہ کھانے کے اندر اسراف ہے کہ ہر وقت کھانے کے متعلق ہی منصوبہ بندی ہو، کیا کھائیں اور کہاں کھائیں یہی زندگی کی فکر بن جائے۔

کھانا اتنا کھائیں کہ جس سے صحت اچھی رہے۔ اللہ کے نام سے شروع کریں اور اللہ کی خاطر ہی کھائیں تاکہ تندرست و توانا رہیں۔ اور کھانا کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کریں۔ اس کے برخلاف اتنا کھانا کہ بیماریاں جنم لیں، سستی اور کابلی پیدا ہو جائے تو یہ اسراف ہوگا۔ صد افسوس کہ آج دنیا کھانے کے اسراف کا شکار ہو گئی ہے۔ امیر ممالک میں اتنا زیادہ کھاتے ہیں کہ کھانا بجائے نعمت کے زحمت (problem) بن گیا ہے۔ بسوں اور جہازوں کی (seats) میں سنا نہیں پاتے، ہسپتالوں میں خصوصی (special) بستر بنانے پڑتے ہیں، یہ سب اسراف کی وجہ سے ہے۔ اس کو بسیار خوری (glutony) کہا جاتا ہے۔ عیسائیت میں بسیار خوری کو سات مہلک گناہوں (seven deadly sins) میں شمار کیا جاتا تھا۔ تو کم کھانے کی عادت ڈالیں، بے تحاشا کھانے سے پرہیز کریں، اس سے وضو برقرار نہیں رہتا، نمازیں قضا ہوتی ہیں، سستی آتی ہے، بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ یہ ہے کھانے میں اسراف اور یہ چیز گناہ میں شامل ہوتی ہے۔ پھر کھانے میں اسراف یہ بھی ہے کہ حلال اور حرام کی تمیز نہ کی جائے۔ باہر ملکوں میں جانے والے بغیر تحقیق کے وہاں کی تیار شدہ غذا میں برگر، کیک اور دیگر اشیاء (hotel foods) کھاتے ہیں جو حرام بھی ہو سکتی ہیں۔ ذبح ٹھیک نہیں ہوتا، سور کی چربی اور گوشت شامل ہوتے ہیں۔ کیک اور پیٹری میں شراب (brandy) وغیرہ کا استعمال عام ہے اور مسلمان وہاں جا کر بڑے آرام سے یہ سب کھا لیتے ہیں یہ اسراف ہے اور گناہ میں شامل ہے۔

{كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا} (الاعراف: ۳۱)

”کھاؤ پیو مگر اسراف مت کرو۔“

حلال حرام کا بہت خیال رکھیں، پھر گھر میں آٹھ دس قسم کے پکوان تیار کروانا کہ لوگ متاثر ہوں گے، میری واہ واہ ہو جائے گی، یہ سراسر اسراف ہے، یہ حد سے گزرنے والی بات ہے۔ کھانے کو ضائع کرنا، چیزیں سڑ رہی ہیں لیکن کسی کو نہ دینا، پکا ہوا کھانا کچرے میں چھینک دینا۔ یہ بھی اسراف ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا کہ تم میں سے اگر کسی کا نوالہ زمین پر گر جائے تو اسے اٹھا کر، جھاڑ کر کھا لو۔

بسکٹ یا کوئی اور خشک چیز فرش پر گر جائے تو اٹھا کر صاف کر کے کھا لینی چاہیے۔ ہمارے

یہاں اس کو تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا ہے، زمین پر گری ہوئی چیز تو ہم کھائی نہیں سکتے، یہ تو بد تمیزی ہے، لوگ کیا سوچیں گے کتنے گنوار (uncivilized) لوگ ہیں۔ حالانکہ یہ عین سنت ہے۔ ایک اور چیز جو ہمارے ہاں تہذیب کی نشانی سمجھی جاتی ہے وہ یہ کہ گلاس میں تھوڑا سا شربت چھوڑ دیا جائے، پلیٹ میں تھوڑا سا سالن چھوڑ دیا جائے، اس کو بعض لوگ قابل تعریف سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ اسراف ہے۔ پلیٹ میں اتنا سالن لیں جو ختم کر سکیں۔ شادی بیاہ میں، دعوتوں میں، بہت سارا کھانا پلٹوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے جو پھر کچرے خانے میں پھینک دیا جاتا ہے، یہ اسراف ہے۔ بچوں کو بچپن ہی سے یہ تربیت دیں اور عادت ڈالیں کہ پلیٹ صاف کرنی ہے، کھانا ضائع کرنا گناہ ہے۔

### قدرتی وسائل میں اسراف:

قدرتی وسائل میں اسراف یا ناقدری کوئی نئی بات نہیں۔ لوگوں کو شعور (awareness) دلایا جائے کہ قدرتی وسائل کا ضیاع غلط چیز ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے تقریباً چودہ سو سال پہلے ہمیں اس کے بارے میں احتیاط کی تلقین فرمادی تھی۔ آپ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا جو پانی کے (کسی کنویں چشمے یا ندی کے) کنارے بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس میں اسراف نہ کرو، تو اس نے عرض کیا اس میں بھی اسراف ہو سکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! دریا کے کنارے بھی وضو میں اتنا ہی پانی استعمال کرنا چاہیے جتنی کہ ضرورت ہو۔

لیکن آج ہم وضو کرتے ہوئے پورا مل کھول دیتے ہیں۔ جب تک ہاتھ پر صابن لگایا، ملا، رگڑا تب تک پانی بہتا چلا جا رہا ہے۔ تین دفعہ کلی کی تو پانی بہہ رہا ہے۔ ناک صاف کرنے میں، مسح کرنے میں کتنا پانی ضائع کیا؟ پہلے تو وضو برتن میں پانی لے کر کیا جاتا تھا ایک ہاتھ سے پانی لیتے اس سے کلی کرتے، ناک صاف کرتے تو پانی ضائع نہیں ہوتا تھا۔ تھوڑے پانی میں پورا وضو مکمل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ حتی الامکان کوشش کریں کہ کل بند کر دیا کریں۔ تھوڑا پانی استعمال کریں خواہ وضو کرنے میں ایک دو منٹ زیادہ لگ جائیں، کوئی بات نہیں! مگر اسراف نہیں ہونا چاہیے۔ نہانے میں بھی بے تحاشا پانی بہانا، شاور (shower) کے نیچے کھڑے رہنا بھی اسراف ہے۔ پانی اللہ تعالیٰ کی بہت قیمتی نعمت ہے، اس کو بہت احتیاط اور بقدر ضرورت استعمال کرنا چاہیے۔ پانی کے بے جا استعمال کی وجہ سے آج کل پوری دنیا میں صاف پانی کی کمی ہے۔ اس کا بھی اللہ کے ہاں حساب ہوگا تو مسلمان کو طبعی ماحول کے بارے میں بہت محتاط (environmentally aware) ہونا چاہیے۔

اسی طرح بجلی بھی ایک کام کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اس کے استعمال میں احتیاط



کرنی چاہیے۔ جس کمرے میں ہوں اُس کی بتی اور پنکھا وغیرہ کھول لیں اور کمرے سے نکلتے وقت پنکھا اور بتی بند کر دیں۔

اسی طرح گیس (gas) کتنی قیمتی نعمت ہے، یہ بھی ہمارے گھروں میں بے تحاشا ضائع ہوتی ہے۔ گیس احتیاط سے استعمال کریں، کھانا پکانے کے بعد چولہا بند کر دیں۔ اس کے علاوہ مین سوئچ بھی بند کر دینا چاہیے کیوں کہ بعض دفعہ گیس نکل (leak) رہی ہوتی ہے۔

عبادت سمجھ کر پانی، گیس اور بجلی بچائیے۔ کہیں اللہ کی نعمتیں ضائع نہ ہوں، ناشکری اور ناقدری نہ ہونے پائے۔ یہ کتبوسی نہیں ہے یہ میاناہ روی ہے۔ بجلی کا مٹن بند (switch off) کرنا بھی عبادت ہے۔ سردیوں میں کمرے سے نکل کر (gas heater) بند کرنا بھی عین عبادت ہے۔

یہ سب کچھ پڑھنے کے بعد ایک احساس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی زندگیوں میں بہت اسراف کیا ہے۔ تو اب کیا کریں؟ سورۃ الزمر کی آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{قُلْ لِيُعْبَدِيَ الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ  
الدُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ} {۵۳}

”اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے اے میرے وہ بندو! جو اپنی جانوں پر اسراف کر بیٹھے ہو تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہونا۔ اللہ سارے گناہ بخش دے گا وہ تو ہے ہی غفور اور رحیم، رحم فرمانے والا۔“

شروع میں ہم نے بات کی تھی کہ ہم نے عادتوں پر ہی کام کرنا ہے۔ اچھے اخلاق کیا ہے؟ عادتوں کا درست ہو جانا۔ اگر ہمیں اسراف کی عادت ہو گئی ہے تو اس عادت کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی عمل صالح ہے۔ قرآن میں ایمان کے ساتھ عمل صالح لازم و ملزوم کی طرح آتا ہے۔ یہ الفاظ ہمیشہ اکٹھے آتے ہیں۔ تو ہم ایک لحاظ سے ان کا ترجمہ یوں بھی کر سکتے ہیں کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی عادتیں اچھی ہیں۔ نماز بھی عادت ہے، روزہ بھی عادت ہے، جو بھی ہم کام کرتے ہیں وہ عادت ہی تو بن جاتی ہے۔ تو اگر ہم نے اپنی عادتیں اچھی کر لیں تو ہم نے عمل صالح لے لیا۔ آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ اے اللہ تعالیٰ ہماری عادت بن جائے کہ ہم اسراف نہ کریں۔ ہمیں اچھے کاموں میں پیسے خرچ کرنے چاہئیں، دین کے کاموں میں اگر بہت زیادہ بھی خرچ کر دیا تو یہ نیکی ہوگی، اس کا بہت اجر ملے گا اور اگر گناہ کے کاموں میں ایک پیسہ بھی لگا یا تو وہ اسراف ہے اور اسراف گناہ ہے۔